سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

جلد: 1 شمارہ: 2 اکتوبر - دسمبر 2024ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

علم نفسیات کے مطابق، خدا کا پہلا تصور والدین سے ملے تاثرات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں اساتذہ کی شخصیت کے تاثرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کی شفقت سے محروم اور اساتذہ کی سختیوں سے گھائل ان بچوں میں خدا سے بھی بے زاری، لاتعلقی بلکہ خوف کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لینے کے بعد وہ خدا کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

(بچوں سے قرآن حفظ کرانا)

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

جلد: 1 شمارہ: 2 اکتوبر - دسمبر 2024ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

علم و آگہی اور شعور و تربیت

فہرست مضامین

1۔	عورت کی گواہی اور قرآن کی تعلیم	مولانا امین احسن اصلاحی / جاوید احمد غامدی	04
2۔	کیا جہنم میں عورتیں زیادہ ہوں گی؟	ڈاکٹر شہزاد سلیم / کوکب شہزاد	08
3۔	حادثے کے بعد حادثے (شذرات)	مدیر	10
4۔	شفا بنت عبداللہ: عمر فاروق کی مشیر	وجیہہ حسان واحدی	15
5۔	اللہ تعالیٰ کی قربت کا تجربہ	کوکب شہزاد	21
6۔	مسئلہ ہماری جڑوں کا!	اغنیٰ جاوید	27
7۔	بچوں سے قرآن حفظ کرانا	ڈاکٹر عرفان شہزاد	30
8۔	گفتگو بدلیے: اپنی زندگی کے لیے	ثوبیہ نورین	44
9۔	ممتا کا راج	محمد وقاص رشید	51
10۔	سوالوں کا جنگل	نعیم احمد بلوچ	55
11۔	لاپتا لیڈیز	وجیہہ حسان واحدی	65
12۔	دی مومنٹ آف لفٹ	صباحت واحدی	68

مولانا امین احسن اصلاحی / جاوید احمد غامدی

عورت کی گواہی اور قرآن کی تعلیم

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰی (البقرہ ۲: ۲۸۲)

اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو لکھے تمہارے مابین کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا اس طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ، جس پر حق عاید ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی۔

تفسیر

قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کی اس آیت کو خواتین کی گواہی سے سلسلے میں پیش کر کے جو احکام سمجھے گئے ہیں اس کے بارے میں علماء میں اختلاف ہوا ہے۔ عام طور پر جو رائے پیش کی گئی ہے اس کے مطابق یہ کہ :

واضح رہے کہ گواہی (شہادت) کے نصاب کو تین قسم کے معاملات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے :

1۔ جیسے حدِ زنا، حدِ سرقہ، قتل کی سزا وغیرہ، اس میں عورتوں کی گواہی سرے سے مقبول ہی نہیں ہے، خواہ ان کے ساتھ مرد ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ عورتوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

2۔ وہ معاملات جن پر مرد مطلع نہیں ہو سکتے : جیسے بچے کی ولادت، عورت کا باکرہ ہونا وغیرہ، اس قسم کے معاملات میں تنہا ایک عورت کی گواہی بھی کافی ہے۔

3۔ مذکورہ دونوں قسم کے معاملات کے علاوہ دیگر معاملات : جیسے نکاح، طلاق، وکالت، وصیت، ہبہ وغیرہ، اس قسم کے معاملات میں عورتوں کی گواہی مقبول تو ہے، مگر تنہا نہیں، بلکہ دو شرائط کے ساتھ۔ پہلی یہ کہ گواہی دینے والی عورتوں کی تعداد "دو" ہو، اور دوسری یہ کہ ان دو عورتوں کے ساتھ کم از کم ایک مرد بھی گواہی دینے والا ہو۔

لہٰذا دوسری قسم کے معاملات کے علاوہ، کسی بھی جگہ تنہا عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہو گی، خواہ اُن کی تعداد کتنی بھی ہو جائے۔ (دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان)

اس رائے کے مقابلے میں جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں :

اِس آیت سے فقہا کا استدلال، ہمارے نزدیک دو وجوہ سے محل نظر ہے : (یعنی اسے اس پر غور کرنا چاہیے کہ کہیں غلط تو نہیں۔)

ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اِس آیت کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ ہر عاقل جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں اور واقعاتی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔ ہم نے اگر کوئی دستاویز لکھی ہے یا کسی معاملے میں کوئی اقرار کیا ہے تو ہمیں اختیار ہے کہ اُس پر جسے چاہیں گواہ بنائیں، لیکن زنا، چوری، قتل، ڈاکا اور اِس طرح کے دوسرے جرائم میں جو شخص بھی موقع پر موجود ہو گا، وہی گواہ قرار پائے گا۔

چنانچہ شہادت (گواہی) کی اِن دونوں صورتوں کا فرق اِس قدر واضح ہے کہ اِن میں سے ایک کو دوسری کے لیے قیاس کا مبنیٰ نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی واقعاتی گواہی اور دستاویزی گواہی کو ایک جیسا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری یہ کہ آیت کے موقع و محل اور اسلوب بیان میں اِس بات کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ اِسے قانون و عدالت سے متعلق قرار دیا جائے۔ اِس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اِس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اِس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ اِس کے مخاطب ادھار کا لین دین کرنے والے ہیں اور اِس میں اُنھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اگر ایک خاص مدت کے لیے اِس طرح کا کوئی معاملہ کریں تو اُس کی دستاویز لکھ لیں اور نزاع اور نقصان سے بچنے کے لیے اُن گواہوں کا انتخاب کریں جو پسندیدہ اخلاق کے حامل، ثقہ، معتبر اور ایمان دار بھی ہوں اور اپنے حالات و مشاغل کے لحاظ سے اِس ذمہ داری کو بہتر طریقے پر پورا بھی کر سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس میں اصلاً مردوں ہی کو گواہ بنانے اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں کسی گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام و اضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اُس کے لیے سہارا بن جائے۔ اِس کے یہ معنی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے کہ عدالت میں مقدمہ اُسی وقت ثابت ہو گا، جب کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اُس کے بارے میں گواہی دینے کے لیے آئیں۔ یہ ایک معاشرتی ہدایت ہے جس کی پابندی اگر لوگ کریں گے تو اُن کے لیے یہ نزاعات سے حفاظت کا باعث بنے گی۔ لوگوں کو اپنی صلاح و فلاح کے لیے اِس کا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ کوئی نصاب شہادت نہیں ہے جس کی پابندی عدالت کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ کی تمام ہدایات کے بارے میں خود قرآن کا ارشاد ہے:

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا. (البقرہ ۲: ۲۸۲)

”یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ مبنی بر انصاف، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی اور زیادہ قرین قیاس ہیں کہ تم شبہات میں مبتلا نہ ہو۔“

ابن قیم اِس کے بارے میں اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں لکھتے ہیں:

فهٰذا فی التحمل والوثیقة التی یحفظ بها صاحب المال حقه، لا فی طریق الحکم وما یحکم به الحاکم، فإن هٰذا شیء وهٰذا شیء. (۱/ ۱۳۲)

''یہ گواہی کا بار اٹھانے اور اُس میں مضبوطی سے متعلق ہے جس کے ذریعے سے کوئی صاحب مال اپنے حق کی حفاظت کرتا ہے، عدالت کے فیصلے سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اور چیز ہے، اور وہ اور۔'' (برھان ۲۹)

تحقیق و تحریر: ڈاکٹر شہزاد سلیم، کوکب شہزاد

کیا جہنم میں عورتیں زیادہ ہوں گی؟

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ أَضْحٰی أَوْ فِطْرٍ إِلَی الْمُصَلّٰی فَمَرَّ عَلَی النِّسَاءِ فَقَالَ: یَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ، تَصَدَّقْنَ فَإِنِّیْ أُرِیْتُکُنَّ أَکْثَرَ أَہْلِ النَّارِ، فَقُلْنَ: وَبِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ؟ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَ تَکْفُرْنَ الْعَشِیرَ.

(بخاری، رقم ۲۹۸)

ترجمہ:

”حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن نماز پڑھنے کی جگہ کی طرف نکلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عورتوں کے گروہ، صدقہ کیا کرو۔ بے شک، میں نے تم میں سے بہت کو آگ میں دیکھا ہے۔ وہ کہنے لگیں: وہ کیوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بہت زیادہ لعنت ملامت کرتی ہو اور اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی ہو۔“

اس روایت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ جہنم میں خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہو گی۔ یہ رائے اس وجہ سے قائم کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں موجود اسلوب

کو صحیح طرح سے نہیں سمجھا گیا۔ یہ اسلوب عام طور پر ان احادیث میں موجود ہوتا ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب بیان ہوئے ہیں۔ اس طرح کے خواب اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے لیے تعلیم کا ذریعہ ہوتے ہیں اور ان میں ان کو تمثیلاً بعض حقائق بتائے جاتے ہیں۔ ان میں حقائق کو علامتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ اہل ایمان کو تعلیم دے سکیں۔ بطور اصول یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس طرح کے تمام خواب تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں اور ان میں جو کچھ دیکھا جاتا ہے، وہ بالکل وہی اور ہو بہو مراد نہیں ہوتا۔ علامتی طریقے کسی حقیقت کے اظہار کا بہت اثر انگیز اور لطیف ذریعہ ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت پردے میں ہوتی ہے، تاہم جو انسان رک کر ان کے بارے میں سوچتا ہے، اس پر یہ بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ وہ اس پر ایسے اثر انداز ہوتے ہیں، جیسے شعر و شاعری۔ وہ انسان کے اندر یہ تحریک پیدا کرتے ہیں کہ وہ ان علامتوں میں جو گہرائی پوشیدہ ہے، انھیں سمجھے۔ وہ اسے غور و فکر پر ابھارتے ہیں اور نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں۔

چنانچہ اللہ کے رسول خوابوں کے ذریعے سے اپنی تعلیم کو مؤثر بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمثیلات اس کی بہترین مثال ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب قرآن میں بیان ہوا ہے۔ انھوں نے اس کی جو تعبیر کی، وہ بھی قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگر انھوں نے یہ دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج انھیں سجدہ کر رہے ہیں تو وہ سمجھ گئے کہ ان آسمانی سیاروں کے ذریعے سے بعض خاص شخصیات کو مراد لیا گیا ہے۔

وہ احادیث جن میں خواتین کی تعداد کو مردوں سے زیادہ بتایا گیا ہے، ان کی تاویل بھی اسی بنیادی اصول کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہ احادیث جہنم میں خواتین کی تعداد ہر گز نہیں بیان کرتیں، کیونکہ یہ تو ان میں بیان کیے ہوئے خواب کی من و عن تاویل ہو گی۔ اس کے برعکس ان احادیث میں انھیں صرف اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ کچھ ایسے اعمال زیادہ کرتی ہیں جو انھیں جہنم میں لے جانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے کاموں سے انھیں پرہیز کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اس حدیث میں خواتین کو ان کے ان اعمال سے متنبہ کرنے کے لیے جہنم سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس وجہ کو علامتی طریقے سے بیان کیا گیا ہے جو انھیں جہنم میں لے جانے کا باعث بن سکتی ہے۔ نہ کہ یہ بیان کرنا مطلوب ہے کہ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ گناہ گار ہوتی ہیں۔ اور کثرت کا مفہوم میجورٹیکے بجائے "بہت سے" ہے۔

نعیم احمد بلوچ

حادثے کے بعد حادثے

اگست میں پاکستان کے شہر کراچی میں ایک خوفناک حادثہ پیش آیا۔ اس کے نتیجے میں موٹر سائیکل پر سوار ایک باپ بیٹی جاں بحق ہوگئے۔ اس کے ساتھ پانچ دیگر افراد شدید زخمی ہوئے۔ موٹر سائیکل اور دوسری گاڑیوں کو خاصا نقصان بھی پہنچا۔ اس حادثے کی ذمہ دار ایک خاتون نتاشا دانش ہیں۔ وہ کئی کمپنیوں کی ایم ڈی اور مالک ہیں۔ ان کا تعلق ایک معروف کاروباری اشرافیہ کے ایک متمول خاندان سے ہے۔ حادثے کے فوراً بعد اس کی سی سی ٹی وی ویڈیوز سوشل میڈیا میں ٹاپ ٹرینڈ کرنے لگیں۔ پولیس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ملزمہ کو گرفتار کر لیتی۔ ملزمہ پر مقدمہ چلتا رہا، وہ اس دوران میں سلاخوں کے پیچھے رہی لیکن اس کے ورثاء اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے حوالات میں ممکن حد تک سہولتیں پہنچاتے رہے۔ آخر کار ٹھیک بیس دنوں کے اندر اندر خاتون کے ورثاء اور حادثے کا شکار ہونے والے تمام فریقوں میں معاملات طے پا گئے اور اسلامی شرعی قانون "دِیَّت" کے مطابق ہر ایک کو معاوضہ ادا کر دیا گیا اور جاں بحق عمران عارف اور آمنہ عارف کے ورثا کی جانب سے حلف نامہ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اہل خانہ نے کہا کہ معاہدہ کسی دباؤ کے بغیر اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے۔ عدالت نے ایک، ایک لاکھ روپے کے مچلکوں کے عوض ملزمہ نتاشا اور خاوند کی درخواست ضمانت منظور کر لی جبکہ منشیات استعمال کرنے کے کیس میں درخواست ضمانت کا فیصلہ محفوظ کر لیا۔ ملزمہ کے وکیل نے کہا کہ نتاشا کو عدالت نے اجازت دی ہے کہ وہ چاہے تو ملک سے باہر بھی جا سکتی ہے۔

اس موقع پر سوشل میڈیا پر ایسی تصویریں گردش کرنے لگیں جن میں وہ وکٹری کا نشان بنا کر، چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے ایک نئی گاڑی میں سوار ہو کر گھر روانہ ہو رہی ہیں۔ اس تصویر کو پاکستان کے دو بڑے نامور اور ذمہ دار صحافیوں نے وائرل کیا تھا۔

یہ ایک دل دوز حادثے کا ڈراپ سین تھا لیکن یہ حادثہ اصل میں اپنے اندر کئی بڑے حادثوں، غلط فہمیوں اور معاشرتی خرابیوں کی گمبھیر تصویر ہے۔

پہلا حادثہ تو یہ ہوا کہ ملزم خاتون کے ورثاء جلد ہی نتاشا کا ایسا میڈیکل سرٹیفکیٹ لے آئے جس کے مطابق وہ بعض نفسیاتی بیماریوں کا شکار بتلائی گئی۔ ان رپورٹس کے ذریعے سے خاتون کے جرم کی شدت کم کر کے اسے فوری ضمانت دلانا مقصود تھی۔ لیکن دوسری رپورٹس بھی سامنے آئیں جس میں خاتون کا نشے کی حالت میں ہونا ثابت ہو رہا تھا۔ پاکستانی جائز طور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا پیسے کے زور پر کوئی بھی مرضی کی رپورٹ حاصل کر سکتا ہے؟ بلاشبہ یہ پاکستانی معاشرے کی بہت ہی بُری تصویر ہے۔

دوسری خبر یہ تھی جس ڈاکٹر نے بھاری رشوت لے کر ملزمہ کو نفسیاتی مریض ظاہر کیا ہے، وہ مسلمان ہے لیکن ایک دوسرے ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسری رپورٹ جاری کی۔ اس نے رشوت کی پیش کش قبول نہیں کی اور لکھا کہ ملزمہ سو فیصد نارمل ہے۔ یہ ڈاکٹر ہندو ہے۔ عام مسلمانوں کے لیے یہ خبر بھی کسی حادثے سے کم نہیں تھی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا اسلام کا ایمان داری سکھانے میں کوئی کردار نہیں؟ اور کیا ہندو مذہب انسان کے اچھے کردار کی ضمانت دیتا ہے؟ یہ سوچ اصل میں اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ اس کے اندر اچھا یا برا انسان اس کا مذہب تشکیل دیتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے نیک فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور تمام مذاہب اصل میں انسان کی اس نیک فطرت کو مخاطب کرتے ہیں۔ وہ اسی کی یاد دہانی کے لیے ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب اپنے ماننے والوں کو جھوٹ بولنے اور بد دیانتی کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ اسے سچائی کی تعلیم دیتا ہے۔ ہندو ڈاکٹر نے اپنی نیک فطرت کو زندہ رکھا اور مسلمان ڈاکٹر نے اسے فراموش کر دیا۔ مذہب تو ایک ٹول کی طرح ہے، جس کا درست استعمال ماننے والے کو باکردار بناتا ہے اور جو اسے فراموش کر دیتا ہے اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سے ہم کسی مذہب کے سچا یا جھوٹا ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ پاکستانی معاشرے میں مذہب کے درست شعور کی آگہی کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس حوالے سے

ہمارے ہاں متعصبانہ رویہ پایا جاتا ہے۔

تیسرا حادثہ وہ واویلا تھا جس میں کہا جا رہا تھا کہ ایک عورت بھلا اتنی بڑی گاڑی کیسے سنبھال سکتی ہے؟ عورت کو گھر میں بیٹھنا چاہیے نہ کہ وہ سڑکوں پر گاڑیاں چلاتی پھرے۔ اسی لیے جب خاتون نے غلطی سے موٹر سائیکل کو ٹکر مار دی، اس کے بعد وہ عورت ہونے کی وجہ سے اس قدر گھبرا گئی کہ ٹکروں پر ٹکریں مارتی گئی۔ اس میں حادثے کا پہلو عورت کے حوالے سے وہ غلط تاثر ہے جو عام طور پر پاکستانی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کی جہالت اور غلط مذہبی نظریات کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور اس بات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اس طرح کے غلط تصورات کی اصلاح کس قدر ضروری ہے۔

چوتھا حادثہ بی بی سی کی یہ خبر تھی کہ ویکٹری کے نشان والی تصویریں جعلی تھیں اور کسی نے اے آئی سے یہ تصویریں بنائی تھیں۔ اور دونوں صحافیوں نے تصدیق کیے بغیر انھیں شائع کر دیا۔ بعد میں احساس ہونے پر انھوں نے معذرت کرتے ہوئے یہ تصاویر ہٹا لیں۔ یہ المیہ بہت ہی پریشان کن ہے۔ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ انسان اگر جلد بازی کا مظاہرہ کرے تو وہ حقیقت سے کس قدر دور ہو سکتا ہے۔ جو ذرائع انسان کو حقیقت سے باخبر کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں، وہ اصل میں دو دھاری تلوار ہیں۔ وہی ذرائع ہمیں گمراہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے کامن سینس اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تصدیق کیے بغیر کسی خبر کو سچا تسلیم نہ کیا جائے اور نہ ہی اسے آگے پھیلایا جائے۔ یہ بات بھی عقل کے فطری استعمال پر مشتمل ہے اور قرآن مجید نے اس کی یاد دہانی کرائی ہے کہ خبر کی تصدیق کیے بغیر اسے نہ مانا جائے اور حضور ﷺ نے تو اس بات کی مزید تشریح میں یہ بھی فرمایا ہے کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ سنی سنائی بات کو آگے پھیلاتا پھرے۔

اس حوالے سے یہ پہلو بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ آج کے جدید دور میں جب ہمارے پاس اطلاعات کے محیر العقول اور ماضی کے مقابلے میں ناقابل تصور قسم کے ذرائع موجود ہیں، ہم کس قدر آسانی سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ سمجھ سکتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کے کردار کو کس قدر بھیانک انداز میں منفی بنا سکتے ہیں جن کے بارے میں پہلے سے منفی قسم کے شواہد موجود ہوں۔ سوچیے کہ اگر آج کے اس دور میں یہ سب کچھ ممکن ہے تو ماضی میں ہم تاریخ کے حوالے سے کتنے گمراہ کن نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ تاریخی معاملے میں، خاص طور پر جب وہ مذہب اور قوم کے متعلق ہوں، نتائج اخذ کرنے

میں کتنی احتیاط کی ضرورت ہے اور اس میں بلیک اینڈ وائٹ رائے بنانا کس قدر گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اسی لیے دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ واقعات سے مذہبی اور قومی نظریات مرتب نہ کیے جائیں اور نہ کسی واقعے کو قانون کا ماخذ بنایا جائے۔ نہ کسی شخصیت کو ہم شیطان سمجھ سکتے ہیں اور نہ کسی واقعے کی روشنی میں کوئی فرشتہ قرار پا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر برصغیر کی تاریخ میں تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات وحادثات میں دونوں ملکوں کی قوموں کو اس پہلو سے اپنے خیالات اور نظریات کا جائزہ لینا چاہیے۔

چھٹا حادثہ اس بدظنی کی صورت میں سامنے آیا کہ اسلامی قوانین کے تحت انصاف نہیں مل سکتا۔ یہ قبائلی قوانین ہیں جو اشرافیہ کے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس قانونِ دیت کے تحت تو انسانی جان، مال اور عزت بھی خریدی جاسکتی ہے۔

یہ تاثر اسلامی قوانین کے حوالے سے قلتِ تدبر اور قلتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ دیت کے قوانین معاشرے میں بہت فلاح کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن ان کو سمجھنے اور نافذ کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ جان بوجھ کر قتل (قتلِ عمد) ہو یا قتل خطا، اس میں جرم دو ہوتے ہیں۔ ایک جرم سٹیٹ کے خلاف اور ایک جرم مُدَّعی یعنی مضروب یا مقتول کے خلاف۔

جہاں تک مضروب یا مقتول کا معاملہ ہے اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ اگر معاف کرنا چاہے اور اپنے نقصان کی قیمت لینے پر آمادہ ہو جائے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ یعنی اگر صاف نظر آرہا ہو کہ ایک حادثے کے تحت یہ نقصان یا قتل ہوا ہے اور اس میں کسی نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا یا حالات مجرم کو رعایت دینے کا تقاضا کر رہے ہیں تو یہ آپشن رکھا ہے کہ مجرم یا ذمہ دار کے ساتھ رعایت برتی جائے۔ اور اس میں اس کے غریب یا امیر ہونے کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر ذمہ دار جیسا کہ اس واقعے میں ہے، مال دار ہے تو اس سے مال لیا جائے گا اور نقصان جس قدر ممکن ہو، پورا کیا جائے گا لیکن وہ اگر غریب یا کم حیثیت ہے تو اس موقع پر حکومت آگے بڑھے گی۔ وہ پابند ہے کہ مقتول کا خون بہا ادا کرے اور دوسرے کے نقصان کو بھی عدل کے ساتھ پورا کیا جائے۔ یہ کسی طور مناسب نہیں ہے کہ مالی حیثیت کسی کو بچانے کا باعث ہو اور کسی کی غربت اس کے مقدر میں سزا لکھ دے۔ ایسا ہوا تو یہ دیت کے قانون کی خلاف ورزی ہو گی۔ دیت کا قانون ماضی میں بھی اور آج بھی معاشرے میں بدلے اور انتقام کی روایت کو روک دینے کا باعث ہے۔ اس سے معاشرے میں امن وامان اور سماجی توڑ پھوڑ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست کسی طور پر بھی ایسے مجرم کو معاف نہیں کر سکتی جس نے مجرمانہ غفلت اور اپنی سماجی حیثیت کے غلط استعمال سے جرم کیا ہے، جیسا کہ بظاہر اس معاملے میں نظر آرہا ہے۔ نشہ کی حالت میں ڈرائیونگ اور قانون کو خریدنے یا جعل سازی سے قانون کو دھوکا دینے کی کوشش ایسے جرائم ہیں جو کسی بھی قسم کی رعایت کے مستحق نہیں۔ نہ پاکستان کا قانون اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ دنیا کا کوئی اور معاشرہ۔ زیر بحث کیس کی یہی چیز اعتراض کی باعث بنی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دیت کا قانون اس بات کی کسی طور پر اجازت نہیں دیتا کہ صرف مالی ہرجانہ لے کر ذمہ دار یا مجرم کو چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے خلاف ریاست سارے حالات دیکھتے ہوئے فیصلہ دے گی کہ مجرم یا ذمہ دار کس قدر رعایت یا کس قدر سخت سزا کا حق دار ہے۔

آخری بات اس حادثے کے حوالے سے یہ کی جارہی ہے کہ وارثین نے ملزمہ کو بچانے کی اتنی کوشش کیوں کی ہے؟ ہمارے خیال میں یہ بہت ہی مثبت اور قابل تعریف بات ہے۔ ایسے حادثوں میں وارثین کا رویہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہی فطری رویہ ہے اور یہی انسانیت کا تقاضا ہے۔ اس سے خیر و برکت کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ البتہ اس میں یہ چیز ضرور مد نظر رکھنی چاہیے کہ معاملہ عدل کے خلاف نہ ہو۔ ناجائز فیور لینے کا نہ ہو جیسا کہ اس معاملے میں بظاہر ہوا ہے۔ یقیناً یہ پہلو قابل مزمت ہے۔ لیکن ورثاء نے نتاشا کا خیال رکھا ہے اور اسے تنہا نہیں چھوڑا تو یہ قابلِ مزمت نہیں قابلِ تعریف بات ہے۔

اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ جن لوگوں کا نقصان ہوا ہے، ان سے ہم دردی اور ان کے نقصان کے ازالے کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہونی چاہیے۔ اس موقع پر بچت ناقابل معافی کنجوسی، سنگ دلی اور کم ظرفی ہے اور جان چھڑانا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس طرح کے حادثے میں ایک دوسری عدالت بھی ہے اور وہ آخرت کی عدالت ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی عدالت میں کسی کی کوئی حیثیت، کوئی چالاکی اور کوئی دھونس نہیں چل سکتی۔ اس کا فیصلہ تو اس عدالت میں ہونا ہے، دنیا کی عدالت کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ یہاں تو مرنے والوں نے کچھ وصول نہیں کیا۔ وہ تو مٹی اوڑھ کر قیامت تک کے لیے خاموش ہو گئے۔ ان کا دعویٰ تو باقی ہے۔ حشر کے دن نتاشا دانش کو ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے!

وجیہہ حسان واحدی

شفا بنت عبداللہ: عمر فاروق کی مشیر

ایک صحابیہ کی زندگی کے چشم کشا گوشے؛ اس سے اسلام کی معاشرت میں خواتین کے اُس کردار کا علم ہوتا ہے جس سے عام طور پر ہم کوئی واقفیت نہیں رکھتے

عرب کے دور جاہلیت کا سوچ کر خیال آتا ہے کہ اس وقت کی عورت اگر آزاد اور خاندانی ہے تو وہ محض دل لبھانے والی اور مرد کی ملکیت ہو گی اور اگر غلام ہے تو ایک بے حیثیت مزدور یا مالک کے لیے ہر جائز ناجائز طریقے سے کمائی کرنے والی ہو گی۔ اس کے بالکل برعکس ہم نے ایسی خاتون کے بارے میں پڑھا جو اس تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری مراد شفا بنت عبداللہ سے ہے۔

ان کا تعلق قریش کے قبیلے عدی سے ہے اور وہ مکہ کے ان لوگوں میں سے تھیں جنھیں پڑھنے لکھنے کی مہارت حاصل تھی۔ یاد رہے اس وقت مکہ میں صرف بیس لوگ یہ علم رکھتے تھے۔ حضرت عمر فاروق بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں میں رشتہ داری بھی تھی۔ ان کا اصل نام لیلیٰ تھا۔ وہ ساتویں صدی میں جزیرہ عرب کے صحرا میں عبداللہ ابن عبدالشمس اور فاطمہ بنت وہب کی ہاں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے علم کی پیاس انھوں نے اپنے والدین سے پائی۔ آفرین ہے ان والدین پر جنھوں نے عرب کی اس جہالت میں بھی اپنی بیٹی کو علم حاصل کرنے کے روشنی دکھائی اور اس کی ہر قدم پر حوصلہ

افزائی کی۔ پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ لیلیٰ نے فن خطاطی بھی سیکھی تھی۔ بی بی سی کے مقالہ نگار وقار مصطفیٰ نے احمد بن جابر کی کتاب "فتوح البلدان" کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ مکہ کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے خطاطی میں یہ مہارت سیکھی تھی۔

لیلیٰ کا نام "شفا" تب پڑا جب انھوں نے ایک اور فن سیکھا اور یہ فن تھا جڑی بوٹیوں کے استعمال سے لوگوں کا علاج کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ فن انھوں نے کسی حکیم یا کسی مدرسہ سے نہیں بلکہ اپنے گہرے مشاہدے سے سیکھا تھا۔ یقیناً موجود معلومات کے بعد انھوں نے مختلف بیماریوں میں اس کا استعمال کیا ہوگا اور اس کے نتائج سے اس وقت کی عام بیماریوں میں موثر جڑی بوٹیوں کا پتا لگایا تھا۔ پھر یہی نہیں انھوں نے ان جڑی بوٹیوں کی دستیابی کا بھی بندوبست کیا تھا۔ اپنے مضبوط مشاہدے کی بدولت اللہ نے ان کے ہاتھ میں بے انتہا شفا عطا کی تھی۔ اسی وجہ سے وہ "شفا" یعنی ہیلر کے نام سے جانی جاتی تھی اور ان کا یہ لقب اس قدر مشہور ہوا کہ اصل نام اس کے پیچھے چھپ گیا۔

قبول اسلام

اللہ تعالیٰ نے انھیں علم کی دنیا کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کی فہرست میں بھی شامل ہونے کی توفیق دی۔

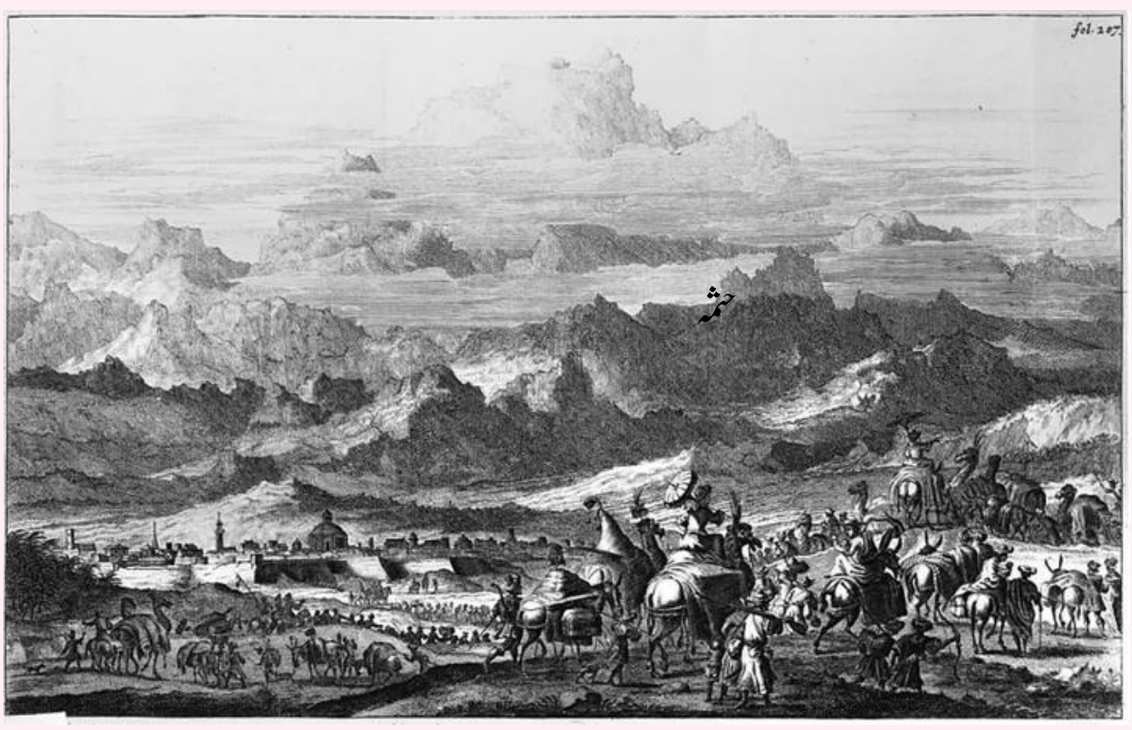

انھوں نے ایسے وقت میں اسلام قبول کیا جب مکہ میں ایمان لانے والوں پر سخت ظلم و ستم کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے خاوند حضرت ابو حثمہ بن حذیفہ عدوی کے ساتھ بہت ابتدائی دنوں ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ایمان لانے کے بعد یا اسی وقت انھوں نے حضور ﷺ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ جڑی بوٹیوں کے ساتھ علاج کرنے کا مشغلہ جاری رکھیں؟ تب حضور ﷺ نے انھیں بخوشی اس کی اجازت دی۔

ایمان لانے کے بعد اس وقت کے حالات کے مطابق کفار نے انھیں تنگ بھی کیا ہو گا لیکن اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ البتہ ان کا اوّلین لوگوں کے ہمراہ مدینہ کی طرف ہجرت کر جانا اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ انھیں کفار سے سخت خطرہ رہتا تھا۔

مدینہ میں شفاء کی حیثیت

ہجرت کے بعد شفاء کی رہائش مدینہ کے بازار کے ساتھ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ گھر حضور ﷺ نے انھیں بطور خاص عنایت کیا تھا۔ حضرت شفاء کا اس قدر خیال یہ صاف ظاہر کرتا ہے ان کی قابلیتوں کی وجہ سے حضور نے انھیں خصوصی اہمیت دی۔ یہاں وہ اپنے شوہر اور بیٹے سلیمان کے ساتھ رہتی تھیں۔

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ پیغمبر اسلام کئی مرتبہ ان سے ملنے گئے اور گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ خریداری اور کاروبار کے بارے میں بہت اچھی اور مفید معلومات رکھتی ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان سے کاروبار کے طریقوں کے بارے میں ان سے مشورے بھی لیے۔ یعنی ایک عورت رسول اللہ کو کاروبار پر مشورے دیتی تھی! دین پر سوالات کرتی تھی! اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اس زمانے میں خواتین کا گھروں میں بند ہو کر رہنے کا تصور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ بازار بھی جاتی تھیں، لوگوں کا علاج معالجہ بھی کرتی تھیں اور دیگر امور میں بھی حصہ لیتی تھیں، جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ شفاء حضرت عمر فاروق کی رشتے دار تھیں، اس لیے وہ حضرت عمر کی بیٹی اور حضور کی اہلیہ ام المومنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنھا سے بھی ملنے آتی تھیں۔ روایات میں آتا ہے کہ سیدہ حفصہ کو شفاء ہی نے لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ چنانچہ روایت میں ذکر ہے ایک مرتبہ حضور ﷺ کی موجودگی میں شفاء آئیں تو آپ نے فرمایا کہ شفاء جیسے تم نے حفصہ کو لکھنا پڑھنا سکھایا، ایسے ہی انھیں "نملہ" نامی

بیماری کا علاج بھی جڑی بوٹیوں سے کرنا سکھاؤ۔" نملہ "ایک جلدی بیماری ہے۔ اس میں جسم پر ایک پھوڑا بنتا ہے، جس کی وجہ سے جسم پر چیونٹیاں چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ عربی میں "نملہ "چیونٹی کو کہتے ہیں ۔اسی وجہ سے بیماری کا نام نملہ ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے دور میں

خلافت راشدہ میں عورت کی معاشرے میں فعال شرکت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر جب خلیفہ بنے تو شفاء سے اقتصادی پالیسی اور تجارت سے متعلق مشورے لیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت شفاء بازار کا مشاہدہ کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ فتوحات کے بعد مدینہ ایک بڑی ریاست کا دارالحکومت بن چکا تھا۔ شہر اور اس کا معاشرہ جیسے جیسے ترقی کرتا گیا، اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ بازار میں خرید و فروخت ایمانداری اور دوسری اسلامی اقدار کے مطابق ہو۔ چنانچہ ان کی نظر انتخاب شفاء پر پڑی انھوں نے شفاء کو مدینہ کے بازار کے انتظام یعنی "قضاالسوق "اور احتساب یعنی "قضاالحسبہ" کی ذمہ داری سونپی۔ بیان کیا جاتا ہے وہ اوزان کے ٹھیک ہونے سے لے کر قیمتوں میں توازن رکھنے کا خیال رکھتیں۔

وقار مصطفیٰ اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ تاجروں کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اگر انھیں کسی خاص لین دین کی قانونی حیثیت میں کوئی شبہ ہو تو وہ شفاء سے پوچھ لیں۔

بے شک اس وقت کی اسلامی حکومت ایک قبائلی حکومت تھی اور باقاعدہ محکموں کا کوئی تصور نہ تھا لیکن اس کی سادہ سی ابتدا ضرور ہو گئی تھی اور اس کا باقاعدہ آغاز حضرت عمر ہی کے دور سے ہوا تھا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں اس ابتدائی دور میں حضرت شفاء کا مقام خلیفہ دوم کی حکومت کی کابینہ کی معزز رکن اور مشیر کا تھا۔

جمال اے بدوی نے اپنی کتاب 'پیغمبر کے دور میں خواتین کا کردار' میں تسلیم کیا ہے کہ شفاء شریعت کے ان قوانین کا علم رکھتی تھیں جن کا تعلق خرید و فروخت اور تجارت سے تھا۔ اور انھیں بازار کی باضابطہ نگران اور محتسب مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اس بات کو یقینی بناتیں کہ سامان کی مناسب قیمت وصول کی جائے اور ناجائز منافع خوری نہ کی جائے۔

ماہر قانون

یوون ریڈلی نے اپنے مضمون 'اقتصادی سرگرمیوں میں مسلم خواتین کی شرکت: ایک نقطہ نظر' میں لکھا ہے کہ شفاء ایک قانونی ماہر اور جج کے طور پر بھی جانی جاتیں اور تنازعات کو حل کرتی تھیں۔ یاد رہے کہ روایات سے یہی باور ہوتا ہے کہ ابتدائی طور پر یہ تنازعات خرید و فروخت اور لین دین ہی سے متعلق ہوتے تھے۔

حضرت عمر کا شفاء کو اپنی ذمہ داری پر برقرار رکھنا یہ گواہی دیتا ہے کہ ان کا تقرر انتہائی کامیاب رہا۔ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب الاستیعاب کی جلد دوم میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے مکہ میں بھی ایک خاتون "سمرہ بنت نہیک" کو قیمتوں کی نگرانی اور جملہ معاملات کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا تھا اور انھیں قانون کیخلاف ورزی کرنے والوں کو موقع ہی پر سزا دینے کا اختیار تھا اور وہ کوڑے مار کر یہ سزا دیتی تھیں ۔ایسا اس لیے تھا کیونکہ پولیس اور تعزیر کا کوئی باقاعدہ محکمہ وجود میں نہیں آیا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد حضرت شفاء کی اقتصادی معاملات میں مہارت کو دیکھتے ہوئے لوگ دیگر جھگڑوں کے فیصلوں کے لیے بھی ان کے پاس آنے لگے اور بطور منصف ان کے فیصلوں کو قبول کیا جاتا۔ وقار مصطفیٰ کے مطابق ابنِ اسحاق جو مسلمانوں کی تاریخ کے پہلے باقاعدہ مصنف ہیں، کے حوالے سے لکھا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے لوگ اسلامی قانون سے متعلق امور میں رہنمائی اور مشورے کے لیے شفاء بنت عبداللہ کے پاس آتے تھے۔

نکولس ایس ہاپکنز اور سعد الدین ابراہیم کی ادارت میں چھپنے والی کتاب 'اسلام میں خواتین: تاریخی اور عصری تحقیق کے مظاہر' میں بھی یہ شہادت ملتی ہے کہ شفاء قانونی ماہر کے طور پر کام کرتی تھیں، انھوں نے بازار میں تنازعات میں ثالث کے طور پر کام کیا اور منصفانہ تجارتی طریقوں کو یقینی بنایا۔

دیگر خدمات

شفاء کیونکہ بہت ابتدائی دور میں اسلام لا چکی تھیں پھر ان کی زندگی گھر کے ساتھ ساتھ گھر سے باہر بھی گزری تھی، اس لیے اسلامی علوم کا گہرا شعور رکھتی تھیں۔ لوگ ان پر اعتبار کرتے کہ وہ انھیں اپنی

دانش مندی اور بصیرت سے درست رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے وقت کی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ خواتین میں سے ایک تھیں۔

شفاء کا ایک دوسرا اعزاز یہ ہے کہ ان سے بارہ احادیث بھی روایت ہوئی ہیں۔ آپکو نبیِّ اکرم اور حضرت عمر سے براہ راست روایت کا اعزاز حاصل ہے اور ان کی یہ روایات امام بخاری، امام نسائی اور ابو داؤد نے اپنی کتب میں درج کی ہیں۔

شفاءبنت عبداللہ کی وفات حضرت عمر ہی کے دورِ خلافت میں ہوئی۔ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ بیٹے کا نام سلیمان بن ابی حَثمہ تھا۔ شوہر کے مقابلے میں تاریخ کی کتب میں شفاء کا ذکر جس قدر کثرت سے ملتا ہے اس سے واضح ہے کہوہ ایک غیر معمولی خاتون تھیں اور شوہر کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت مثالی رہے۔ شفاء کی زندگی میں ان کے شوہر ابو حثمہ کی دوسری شادی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

حضرت شفاءِ کے تاریخی کردار کی اہمیت

آج کے دور میں شفابنت عبداللہ کی سیرت ایک طاقتور یاددہانی ہے۔ وہ یہ کہ عورت کا تعلیم یافتہ ہونا معاشرتی ترقی اور معاشرتی تبدیلی کا ایک بنیادی ستون ہے۔ اوران کی زندگی اسلامی معاشرت کی اُس تصویر سے یک سر مختلف ہے جس کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

کوکب شہزاد

اللہ تعالیٰ کی قربت کا تجربہ

ایک ماں کی خدا پر یقین کی ایسی سچی داستان جو آپ کا ایمان مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ گواہی دینے پر مجبور کر دے گی کہ اللہ نے ماں کا رتبہ باپ سے تین گنا کیوں رکھا ہے؟ اور یہ حقیقت بھی ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ بچہ ماں کی کوکھ سے باہر آکر بھی اسی کی کوکھ میں رہتا ہے! آپ کے پاس بھی اس طرح کے تجربات ہوں تو یہ صفحات حاضر ہیں۔ (مدیر)

یہ میری زندگی کے کچھ حقائق ہیں جنھیں میں بیان کرنا چاہتی ہوں۔ میرا مقصد لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا پروردگار جو ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں کا خالق ہے، اس عظیم پروردگار نے ہمیں پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا، بلکہ وہ قدم قدم پر بالکل اسی طرح ہمارے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح ایک ماں اپنے اس بچے کے ساتھ ہوتی ہے جس نے ابھی نیا نیا چلنا سیکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. (البقرہ ۲: ۱۸۶)

”اے محمد، جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے۔“

اس تحریر کو لکھنے کا سبب یہ ہے کہ ہمارے اندر کے کچھ لوگ، اگرچہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے کیوں نہ ہوں، اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے اور اپنی دعائیں قبول کرانے کے لیے ہمیں مزاروں پر جانا چاہیے۔ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں اور ان کی دعائیں اللہ تعالیٰ رد نہیں کرتے، جب کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے پکارو، میں تمھاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ مجھے کسی سفارش اور وسیلے کی ضرورت نہیں اور خاص طور پر جو لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، ان سے وسیلے کی درخواست کرنا اور ان کی قبروں پر آ کر دعا کرنا شرک ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ. (النساء ۴: ۴۸)

”بے شک، اللہ تعالیٰ اس چیز کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا کسی کو شرک بنائے۔ اس کے سوا جو چاہے گا، معاف کر دے گا۔“

آیئے، اب ہم ان واقعات کی طرف آتے ہیں جن میں میں نے اپنی مشکلات میں جب جب اللہ تعالیٰ کو پکارا، اس نے معجزاتی طور پر میری دعا قبول کی اور اس طرح قبول کی کہ میں حیران ہو گئی۔

الحمدللہ، میرا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام ابراہیم ہے۔ جب وہ آٹھویں نویں کا طالب علم تھا۔ اس نے ایک دن اپنے والد سے کہا کہ بابا، میں جب کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے چکر آتا ہے اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہم نے لاہور کے ایک معروف ڈاکٹر سے وقت لیا اور اس کے چیک اپ کے لیے اسے ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں بتایا کہ خدا نخواستہ ابراہیم کو مرگی ہے۔ یہ سن کر میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور شہزاد صاحب بھی بہت پریشان ہوئے۔ ہم نے کسی دوسرے ڈاکٹر سے بھی رائے لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بھی یہی بات کہی اور اس نے اس بیماری کی دوا بھی شروع کر دی۔ اس طرح کی دواؤں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مریض سارا دن سویا رہتا ہے۔

میں جب ابراہیم کو اس حالت میں دیکھتی کہ وہ زیادہ تر وقت سویا رہتا تھا اور اسکول بھی نہیں جا سکتا تھا تو میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ سے دل ہی دل میں یہ کہتی کہ اللہ تعالیٰ آپ نے مجھے

ایک ہی اولاد دی ہے اور اس کو بھی ایسی بیماری دی ہے جس کا نام بھی کوئی ماں نہیں سن سکتی۔

شہزاد صاحب نے اپنی بہن سے بات کی جو کینیڈا میں رہتی ہیں اور وہ سائیکالوجسٹ ہیں۔

سعدیہ نے شہزاد صاحب سے کہا کہ آپ ابراہیم کا ایم آئی آر کرا کر بھیجیں۔ میں اپنی دوست عامرہ رانا سے جو اینکالوجسٹ ہیں، ان سے رائے لیتی ہوں۔ وہ چونکہ ڈاکٹر ہے تو ہر فیلڈ کے ڈاکٹر اس کے واقف ہیں۔ وہ سب سے مشورہ کر کے ہمیں بتا دیں گی۔ ہمارے گھر کے قریب نیشنل ہسپتال ہے۔ وہاں سے ہم نے ایم آئی آر کے لیے وقت لیا۔ مقررہ دن ہم ابراہیم کو لے کر نیشنل ہسپتال پہنچ گئے۔

ایم آئی آر جتنی دیر ہوتا رہا، میں اس عظیم بادشاہ، رحمٰن اور رحیم اور قدرت رکھنے والے رب کے سامنے اپنی بے حیثیتی کا اعتراف کرتے ہوئے سجدے میں گری رہی۔ میرے دماغ میں اور کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ میں بالکل ذرۂ بے حیثیت ہوں اور بس سب کچھ تو ہی تو ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ حضرت زکریا کی دعا 'لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا' پڑھتی جا رہی تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مولا میں تجھ کو پکار کر کبھی مایوس نہیں ہوا۔

مکمل ہو گیا۔ اس کی رپورٹ کینیڈا بھیجی گئی۔ ڈاکٹر عامرہ رانا نے اس کو پڑھ کر ہمیں بتایا کہ یہ رپورٹ بالکل صحیح ہے۔ ابراہیم کو الحمد للہ کوئی بیماری نہیں۔ عامرہ رانا کی یہ بات سن کر میرا وجود خوشی سے لرزنے لگا۔ اے پروردگار، میں تیرا کیسے شکر ادا کروں۔ میرے پاس تو وہ الفاظ ہی نہیں جو تیرے شایان شان ہوں۔ میرے دل میں یہ احساس تھا کہ اے پرودگار، کون کہتا ہے کہ تجھ سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے کسی سفارش کی ضرورت ہے۔ تو تو میری ہر پکار کو سنتا ہے۔ میں سجدۂ شکر ادا کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر اس کے دربار میں گر گئی۔ یہ اس عظیم پروردگار کا مجھ پر سب سے بڑا احسان تھا۔ یہ اس پروردگار کی ایسی عنایت تھی جس کا احساس ایک ماں ہی کو ہوتا ہے۔ آج میرا بیٹا ابراہیم الحمد للہ اپنی تعلیم مکمل کر کے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو چکا ہے۔

ابراہیم سے متعلق ایک اور واقعہ میرے ذہن پر اپنے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ جسے یاد کر کے میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تو بس میرے دائیں بائیں ہی ہے۔ ایک بہت ہی عجیب واقعہ ہوا۔ اس واقعہ نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اپنے بندوں کے لیے اس کی قبولیت پر اعتماد نے میرے یقین اور اعتماد کو اتنا بڑھا دیا کہ اب میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اللہ تعالیٰ میری دعا کو رد کریں گے یا دعا کی قبولیت کے

لیے مجھے کسی اور کے دروازے کو کھٹکھٹانا پڑے گا۔ میری دعا کی قبولیت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق دیر ہو سکتی ہے، لیکن دعا کی شنوائی ضرور ہو گی۔

ابراہیم سے متعلق کچھ اور بھی واقعات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر میرا اعتماد اور یقین بہت بڑھ گیا۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ ہمیں نظر تو نہیں آتا، مگر کائنات کا چپہ چپہ اس کے وجود کی گواہی دیتا ہے۔ میرا وجود، میری زندگی، یہ زمین، یہ آسمان، بارش، دھوپ، یہ پہاڑ، یہ ندی نالے، یہ سمندر، یہ سورج چاند ستارے ،ان سب کے اندر نظم وضبط اس اللہ کے وجود پر گواہی دیتا ہے۔ کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔ ایک گھر کسی مالک کے بغیر نہیں چلتا تو اتنی بڑی کائنات جس کا بہت معمولی سا حصہ ہمارے علم میں ہے، وہ کسی ہستی کے بغیر کیسے چل سکتی ہے۔

ہوا کچھ ایسے کہ میرے بیٹے کے اسکول میں ٹینس کے ٹورنامنٹ ہو رہے تھے۔ ٹینس ہمارے گھر کا پسندیدہ کھیل ہے۔ ابراہیم کو بھی یہ کھیل بہت پسند ہے۔ ابراہیم نے اس ٹورنامنٹ میں حصہ لیا۔ ماشاء اللہ وہ میچ جیتتے جیتتے فائنل میں پہنچ گیا۔ فائنل میچ دیکھنے کے لیے اسکول کی انتظامیہ نے دونوں بچوں کے ماں باپ کو بھی بلایا تھا۔ جو لڑکا ابراہیم کے مدمقابل تھا وہ گذشتہ پانچ سالوں سے ٹینس کا چمپئن تھا۔ اگر وہ یہ میچ جیت لیتا تو ایچیسن کالج میں یہ ایک ریکارڈ ہوتا۔ وہ لڑکا اپنے قد کاٹھ میں ابراہیم سے بہت لمبا اور چوڑا تھا۔ شہزاد نے اسے دیکھتے ہی اپنی رائے دے دی کہ ابراہیم اس سے کبھی بھی نہیں جیت سکتا۔ میرا طریقہ ہے کہ میں ہمیشہ مثبت سوچ رکھتی ہوں۔

مجھے منفی سوچ بالکل پسند نہیں۔ مجھے شہزاد کا یہ تبصرہ بالکل پسند نہ آیا۔ میں نے شہزاد سے کہا کہ آپ مجھے میچ کی صورت حال بتاتے جائیں۔

میچ شروع ہوا۔ ابراہیم سخت گھبرایا ہوا تھا۔ بچپن سے ہی اسے ہارنا پسند نہیں تھا۔ بہرحال میچ شروع ہوا۔ وہ لڑکا بہت پراعتماد تھا۔ وہ بہت اچھا کھیل رہا تھا۔ شہزاد صاحب مستقل تبصرہ کیے جا رہے تھے، جس سے مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہلا کر کہتے کہ یہ بچہ بہت اچھا کھیل رہا ہے۔ یہی جیتے گا، ابراہیم کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں تو بس اپنی دعاؤں میں مصروف تھی۔ مجھے ٹینس کی الف ب کا بھی پتا نہیں تھا۔ میچ کو تو میں دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔ بس دعا ہی کیے جا رہی تھی کہ میرے اللہ ابراہیم کو جتادے۔ ابراہیم شکست برداشت نہیں کر سکتا اور میں ابراہیم کو دکھی نہیں دیکھ

سکتی۔ پہلا سیٹ ابراہیم ہار گیا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ ابراہیم سخت پریشان تھا۔ ایک ماں اپنے بیٹے کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ میری دعاؤں میں اضافہ ہو گیا۔

دوسرا سیٹ شروع ہوا۔ وہ لڑکا بڑی مہارت کے ساتھ کھیل رہا تھا اور شہزاد کی کمنٹری بھی جاری تھی۔ میں اپنے رب سے اور قریب ہو گئی اور کہنے لگی کہ میرے پروردگار مجھے اپنے بیٹے کی فتح چاہیے اور یہ کام آپ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ میچ ختم ہونے کے قریب تھا۔ اب پوائنٹس برابر جا رہے تھے۔ شہزاد ،ابراہیم کی ہار کو تسلیم کر چکے تھے، لیکن ایک ماں تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ اب ابراہیم کے پوائنٹس بڑھنے لگے۔ مقابلہ سخت تھا۔ دونوں جیتنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر اچانک کیا ہوا کہ کھیلتے کھیلتے یہ لڑکا گر گیا اور ایک شور سا بلند ہوا ''اوہو'' میں نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ وہ لڑکا زمین پر گرا ہوا تھا اور کوچ اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لڑکے کا جو ابراہیم کے ساتھ میچ کھیل رہا تھا، اس کی ٹانگ کا مسل "پُل" ہو گیا اور وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا۔ وہ آگے میچ کھیلنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ابراہیم میچ جیت چکا تھا۔ سابقہ چیمپئن کا شکست اور تکلیف سے برا حال تھا۔ میں نے اپنے بچے کی فتح تو مانگی تھی، لیکن اس بچے کو تکلیف میں دیکھ کر میری ممتا کو بھی تکلیف ہوئی۔ اس لڑکے کے قریب جا کر اسے پیار کیا اور تسلی دی۔ ظاہر ہے کہ اس بچے کی یہ تکلیف عارضی تھی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ٹھیک ہو گئی۔

اللہ کو پکارنا رائیگاں نہیں جاتا۔ بس تھوڑی سی دیر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس بندے کو مجھ پر کتنا اعتماد ہے اور اس کے دل میں کتنی کھوٹ ہے۔ اپنے کسی مضمون میں میں ان شاءاللہ پیغمبروں کے واقعات بیان کروں گی جن سے معلوم ہو گا کہ انھوں نے بھی اپنی ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کو پکارا اور اللہ نے ان کی مرادیں پوری کیں۔

اس واقعے کو بیان کرنے کا مقصد ہے کہ کبھی ہمت نہ ہاریں۔ اپنے رب سے لو لگائیں۔ ہر موقع پر اسی کو پکاریں۔ دعا کی قبولیت کے لیے کسی قبر یا مزار پر نہ جائیں۔ جلد یا بدیر آپ کی دعا ضرور قبول ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کو نہیں پسند کہ اس کے بندے اس کے علاوہ کسی اور کو پکاریں۔ میری زندگی میں یہ واقعات کسی معجزے سے کم نہیں۔ کبھی کبھی دعا کی قبولیت میں دیر ہو جاتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتے ہیں کہ میرا بندہ میرے اوپر اعتماد رکھتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات میں سے دو صفات ''سمیع'' اور ''بصیر'' ہیں، یعنی وہ اپنے بندوں کو دیکھ بھی رہا ہے اور ان کی باتیں اور دعائیں سن بھی رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ اپنی کائنات کے امور سلطنت سنبھال رہا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ. (۲: ۲۵۵)

''(اُس دن معاملہ صرف اللہ سے ہو گا)۔ اللہ، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا۔ نہ اُس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں کسی کی سفارش کرے۔ لوگوں کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے اور وہ اُس کے علم میں سے کسی چیز کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے، مگر جتنا وہ چاہے۔ اُس کی بادشاہی زمین اور آسمانوں پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی حفاظت اُس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوتی، اور وہ بلند ہے، بڑی عظمت والا ہے۔''

اغنیٰ جاوید

مسئلہ ہماری جڑوں کا

جڑیں کیا ہیں؟ جو ہمیں مضبوطی سے جکڑ کر رکھیں۔ ہمیں سہارہ دیں۔ استقامت اور ثابت قدمی دیں۔

اس حسین دنیا میں خواہ وہ درخت ہوں یا پودے، ان کی جڑیں ان کو زمین سے جوڑ کر رکھتی ہیں۔ چاہے طوفان آئے یا آندھی، جتنی گہری جڑیں اتنی ہی ثابت قدمی۔ بقا کا اتنا ہی امکان۔

لیکن ہمارا اصرار ہے کہ جڑیں انسان کی بھی ہوتی ہیں۔ اسی سے وہ اپنے معاشرے سے جڑا رہتا ہے۔ معاشرے میں وطن، تہذیب، مذہب، زبان اور وہ ساری سوغاتیں ہیں جو وہ اپنے ماحول میں پاتا ہے۔

اس حقیقت سے بھی ہم سبھی واقف ہیں کہ اگر پودے کی جڑیں کمزور ہوں تو وہ جتنا بھی سرسبز کیوں نہ ہو، وہ جتنا بھی بلند و بالا کیوں نہ ہو، اس کا کتنا ہی خیال کیوں نہ رکھا گیا ہو، وہ زمین بوس ہو کر رہتا ہے۔ یعنی جڑ مضبوط تو پیڑ مضبوط۔

اب پودوں کے برعکس انسان نے تو چلنا ہے۔ اور وہ اس شان سے چلا کہ تاریخ کے ہر صفحے پر اور زمین کے ہر خطے پر اس نے اپنی سطوت اور صنّاعی کے نشان چھوڑے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں وہ اپنی جڑوں سے الگ بھی ہوا ہے اور اس کو ساتھ بھی لے کر چلا ہے۔

ریچل ولچن نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ اگر ہمیں ایک ہی جگہ رہنا ہوتا تو یقیناً ہمارے پاؤں نہ ہوتے، جڑیں ہی ہوتیں۔ اسی لیے معاش کی تلاش، بہتر زندگی کی لگن، اپنے آپ کو منوانے کی جستجو اور تجارت و تحفظ کی ضروریات نے انسان کو پوری دنیا میں بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ذرائعِ آمد و رفت جتنے زیادہ آسان

اور کثیر ہو رہے ہیں، انسان کی ہجرتیں اور سیاحتیں کثیر سے کثیر تر ہوتی جا رہی ہیں۔

ان حقائق کے پیشِ نظر میں اگر میں اپنا جائزہ لوں تو میں دیکھتی ہوں کہ ہمارا خاندان چار افراد پر مشتمل ہے۔ اور ہم بہتر زندگی کی تلاش میں کراچی کے ساحل سے اٹھے اور سب سے پہلے سوئٹزرلینڈ کی چوٹیوں میں جا پہنچے۔ پھر سنگاپور کی رونقوں میں جا بسے، وہاں سے سیگون میں کچھ وقت گزارا، پھر ہمیں سیول راس آیا اور آخر میں کینیڈا کا ٹورنٹو ہمیں بھا گیا۔ کچھ معلوم نہیں کہ قسمت نے اور کہاں کہاں کا نمک ہماری زندگی میں رکھا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ انسان جن کی جڑیں اپنے ماحول سے مضبوط تھیں اور جنھیں اپنی جڑوں پر یقین اور اعتماد تھا کہ وہ برتر ہیں، انھوں نے چاہے ایک برِّاعظم سے دوسرے براعظم تک کا سفر بھی کر لیا، وہ نوآبادیاتی دور سے بھی گزرے یا ملک ملک اپنی صنعتیں قائم کر لیں، انھوں نے نشاۃ ثانیہ کا مرحلہ بھی طے کر لیا، اگر ان کی جڑیں اپنے ماحول کے ساتھ وابستہ تھیں تو ان کا کلچر بھی باقی رہا، جتنا ایک مذہب پر ایمان تھا، اتنا مذہب بھی سلامت رہا، طریقہ بود و باش بھی اور زبان بھی پوری طرح قائم دائم رہی۔

مشہور واقعہ ہے ہندستانی لیڈر مولانا ابو الکلام آزاد سے ایک سیاسی ملاقات کے لیے انگریز وائس رائے ویول ان کے گھر آئے۔ مولانا آزاد نے ترجمان کی خدمات لیں۔ دورانِ گفتگو مولانا آزاد نے اردو میں جو بات وائس رائے سے کہی، ترجمان نے اسے ٹھیک طرح سے نہ سمجھا اور وائس رائے ویول کو انگریزی میں بیان کر دیا۔ مولانا آزاد نے ترجمان کو ٹوکا اور انگریزی ہی میں کہا کہ میری بات یہ ہے، یہ نہیں۔ وائس رائے حیرت سے بولے: مسٹر آزاد اگر آپ کی انگریزی اتنی اچھی تھی تو آپ کو ترجمان کی کیا ضرورت تھی؟

انھوں نے جواب دیا: "جناب آپ سات سمندر پار آکر اپنی زبان نہیں بھولے تو میں اپنے گھر میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں، ناگزیر طور پر اس کے اثرات قبول کرتے ہیں اور اگر ہمارا ماضی اور ہمارا کلچر ہماری ترقی میں رکاوٹ اور ماحول ہمیں اجنبی سمجھ کر اگل دینے کا خدشہ ظاہر کر رہا ہو تو ہمارا تعلق اپنی جڑوں سے کم زور ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس اس وقت پوری شدت سے ہوتا ہے جب عیدین جیسے تہوار آتے ہیں، کوئی ثقافتی محفل یا شادی بیاہ کی تقریب منعقد ہوتی ہے تو ہماری "جڑوں"

سے محبت عود کر آتی ہے۔ یہ محبت اس وقت بھی محسوس ہوتی ہے جب ہم اپنے روایتی کھانوں کی لذت سے محرومی محسوس کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص لباس کے حسن اور آسانی کی ہمیں یاد آتی ہے۔ اس موقع پر یہ احساس بڑی شدت سے ہمیں دامن گیر ہوتا ہے کہ ہم اپنی روایات سے دور ہو رہے ہیں۔

وہ روایات کیا ہیں؟ روایات تو رسم و رواج اور ثقافت کا مجموعہ ہے جو نسل در نسل ہماری پہچان بن چکی ہیں اور یہ خاص طور پر مختلف کلچرل اور مذہبی تہواروں پر نظر آتی ہیں اور ہمیں غیر ملکیوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کلچر کے ساتھ اس کے کلی ٹکراؤ پر ہمیں بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

اسی موقع پر ہمیں اس حقیقت کو ماننا ہوگا کہ انسانی تہذیب ارتقاء سے عبارت ہے اور اس میں تبدیلی ناگزیر ہے، چاہے ہم اپنے ماحول میں ہوں یا کسی اور ماحول میں۔ یہی وہ چیز ہے جسے اقبال نے اپنے خوب صورت شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کار خانے میں
ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں!!!!

اجنبی سماج اور معاشرے بھی ہمیں بہت سی خوبصورت تعلیمات دیتے ہیں۔ ہم اس میں رہ کر سیکھتے ہیں کہ دنیا کو اور اس کے مسائل کو ایک الگ نقطہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم تنوع کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ اس کے رنگوں کو اپنے حدود میں رہ کر اپناتے ہیں۔ اس سے ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔

ہم اور ہماری نسلیں انھیں بنیادی باتوں کو سامنے رکھ کر ہر سماج اور ہر معاشرے میں اپنی جڑوں کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کا ایک اہم رکن بن کر اس کا حصہ بھی بن سکتے اور اپنی شناخت بھی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اور پھر دنیا دیکھے گی کہ ہم کس طرح گلوں کی طرح کھلیں گے، پھلیں اور پھولیں گے۔ نسلوں در نسلوں تک زندہ اور برقرار رہیں گے۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

بچوں سے قرآن حفظ کرانا

مسلمان معاشروں میں بچوں کو حفظ قرآن کرانا ایک بہت بڑی سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس مضمون میں اس انتہائی اہم موضوع پر مصنف نے دلائل سے واضح کیا ہے ایسا کرنا کیا دین میں مطلوب ہے؟ قرآن کے حفظ کرنے میں فضائل کی کیا حقیقت ہے اور خود معاشرے اور بچوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

عہدِ رسالت سے قرآن مجید حفظ و تحریر دونوں طریقوں سے محفوظ اور منتقل کیا گیا۔ صحابہ اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق قرآن مجید مکمل یا جزواً یاد کر لیتے تھے۔ لیکن رسمی حفظِ قرآن اور بچوں کو بالجبر قرآن یاد کرانے کا کوئی تصور نہ تھا۔

مسلمانوں کو ایک طویل عرصے سے یہ باور کرایا گیا ہے حفظِ قران کی سعادت حاصل کرنے کی بہترین عمر بچپن کی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک حافظِ قرآن اپنے خاندان کے دس ایسے افراد کو جنت میں لے جانے کا ذریعہ بنے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی۔[1] حافظِ قرآن کے والدین کو روزِ قیامت ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی روشنی سے بھی زیادہ ہو گی۔[2] ان ترغیبات کے زیر اثر والدین یہ سعادت حاصل کرنے اور جہنم سے بچنے کے لیے ہر قیمت پر اپنے بچوں کو قرآن حفظ کرانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ گلی، محلوں، گاؤں اور شہروں میں جگہ جگہ کھلے ہوئے حفظ قرآن کے مدارس ایسے ہی بچوں

سے آباد اور ایک بڑے طبقے کے معاش کا ذریعہ ہیں۔

حفظِ قرآن سے متعلق محولہ بالا روایات ضعیف ہیں اور دین کے مسلّمہ اصولوں کے بھی خلاف ہیں۔ قرآن مجید ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے،[3] وہ بتاتا ہے کہ خدا کی عدالت میں کوئی کسی دوسرے کے کام نہیں آئے گا، وہاں بغیر میرٹ کے کسی کی سفارش نہیں کی جاسکے گی۔[4]

مگر والدین ان بر سر خود غلط ترغیبات سے متاثر ہو کر اپنے کم سن بچوں کو زبردستی حفظ کرانے کے لیے کسی مدرسے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ بلکہ ترجیحاً اپنے گاؤں، محلے اور گھر سے دور کسی مدرسے میں داخل کراتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے علاقے اور گھر کے قریب کے مدرسے میں بچے کی توجہ اپنے خاندان اور دوستوں سے ملنے کی تڑپ میں منتشر رہتی ہے، چناں چہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسے ان سب سے دور بھیج دیا جائے، جہاں وہ کوئی شناسا نہ پائے اور پوری توجہ سے قرآن مجید حفظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔

والدین کی شفقت اور احساس تحفظ سے محروم ہو جانے کے بعد ایک اجنبی ماحول میں بچہ جس جذباتی المیے سے گزرتا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بچپن کے لاابالی پن سے لطف اندوز ہونے کی عمر ایک سخت روٹین کے شکنجے میں پھنس جاتی ہے۔ ایک محدود ماحول میں مقید ہو جانے سے معاشرتی رویے سیکھنے کے مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ مختلف عمر اور مزاج کے لڑکوں اور اساتذہ کے درمیان اس کی معصومیت بھی ہمہ وقت خطرے میں رہتی ہے۔ بچہ جتنا کم عمر، خوش شکل اور والدین کی خبر گیری سے دور ہوتا ہے، اس کے استحصال کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔

راقم کو ایسے والدین دیکھنے کا موقع ملا جن کے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی۔ انھیں خبر کی گئی، وہ آئے مگر بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے اسے تسلی دے کر پھر اسی مدرسے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت ہوا تو ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں اسے داخل کرا دیا، مگر حفظِ قرآن مکمل کرائے بغیر وہ اسے واپس لے جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے لیے ایسے حادثات غیر متوقع نہیں تھے۔ ان خدشات کو گوارا کرتے ہوئے ہی وہ اپنے کم سن بچوں کو اجنبی ماحول کے سپرد کر آتے ہیں۔

بچے سے قرآن حفظ کروانے کے لیے والدین نہ صرف خود اس پر تشدد کرتے ہیں بلکہ اساتذہ کو بھی اس کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بے اصل روایت بھی مشہور کرا رکھی ہے کہ جسم کے جس

حصے پر استاد کی مار پڑتی ہے اس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ تشدد کی صورت میں بچہ اگر زخمی ہو جائے یا، خدانخواستہ، اس کی موت واقع ہو جائے تو والدین عموماً استاد کو معاف کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق بچہ خدا کی راہ میں شہید ہو گیا۔ یوں والدین کی آخرت سنور گئی۔ یہی نصب العین تھا جو قبل از وقت حاصل ہو گیا۔ اس "خدمت" کے عوض استاد کو سزا کیوں دی جائے؟ سزا سے مامونیت کی یہ توقع تشدد پسند طبائع کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

کچھ بچوں میں اتنی ذہنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ پورا قرآن یاد کر سکیں۔ راقم کے تجربے میں ایسے والدین بھی آئے جنھیں بتایا گیا کہ ان کا بچہ حفظ نہیں کر سکتا، لہذا اسے مجبور نہ کیا جائے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بضد رہے کہ بچے کو ہر صورت حفظ کرایا جائے۔ ان کے مطابق، حفظ کرنے کی محنت سے دماغ تیز ہو جاتا ہے۔

ایسے بچوں کو برسوں حفظ کی چکی میں پیسا جاتا ہے۔ سبق یاد نہ کر سکنے کی پاداش میں مار پیٹ اور ذلت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہم سبق بچوں کے سامنے وہ نکو بن کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں باور کرایا جاتا ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، اسی وجہ سے ان کی یاداشت کام نہیں کر رہی۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ حافظ کے ساتھ عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ شیطان لگے ہوتے ہیں جو اسے حفظ کی سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورت حال کسی اذیت گاہ (ٹارچر سیل) سے کم نہیں ہوتی، جہاں بچہ ہر صبح یہ سوچ کر اٹھتا ہے کہ تشدد اور ذلت کا ایک اور طویل دن اس کا منتظر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک گناہ گار شخص ہے جس سے اس کے والدین راضی ہیں نہ اساتذہ اور نہ ہی خدا۔ ہم مکتب ساتھیوں کی نظروں میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ بچے مدرسے اور گھر سے بھاگ جاتے ہیں تو پکڑ پکڑ کر لائے جاتے ہیں اور بھاگنے پر تشدد اور ذلت الگ سہتے ہیں۔ ان کی عزت نفس ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ مکمل طور پر منفی نفسیات میں جیتے ہیں۔ یہ نفسیات ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر لیتی ہے اور مختلف منفی رویوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ بہت سے طلبہ میں انھی وجوہات سے قرآن مجید سے بدمزگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

علم نفسیات کے مطابق، خدا کا پہلا تصور والدین سے ملے تاثرات سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں اساتذہ کی شخصیت کے تاثرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کی شفقت سے محروم اور اساتذہ کی سختیوں

سے گھائل ان بچوں میں خدا سے بھی بے زاری، لاتعلقی بلکہ توحُّش کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ والدین کی شفقت اور ان کی دیکھ بھال کے بغیر جینا سیکھ لینے کے بعد وہ خدا کی محبت، اس کی رحمت اور اس کے سامنے اپنی محتاجی کے احساس سے بھی بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ والدین سے ناراض ہوتے ہیں مگر ان کی ناراضی سے ڈرتے بھی ہیں۔ یہی نفسیات خدا کے ساتھ ان کے تعلق میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ وہ خدا سے محبت نہیں کر پاتے، لیکن اس سے ڈر کے احساس کے تحت اس کی رسمی اور قانونی قسم کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی نفسیات لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عام طور پر خوف دلاتے اور جبر اور دھونس سے بات منواتے نظر آتے ہیں۔

بچہ ہو یا بڑا اس کی مرضی کے بغیر اسے کسی ایسی ذہنی یا جسمانی مشقت میں مبتلا کرنا جس کا مطالبہ دین اور عقل نہیں کرتے، اس کا استحصال ہے۔ حفظ قرآن ان بنیادی مہارتوں کی تعلیم نہیں ہے جن کا سیکھنا ناگزیر ہوتا ہے اور اس بنا پر انھیں بچپن میں بالجبر بھی سکھایا جاتا ہے، جیسے لکھنا پڑھنا، ابتدائی ریاضی وغیرہ۔

دس سے بارہ سال کی وسیع البنیاد تعلیم پانا تعلیمی رجحان رکھنے والے ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ اس کے بعد اس کا خصوصی رجحان دیکھ کر فیصلہ کیا جانا چاہیے کہ اسے کس طرح کی تخصیصی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ حفظ قرآن ایک تخصیصی تعلیم ہے، یہ فرد کی مرضی اور رجحان جانچے بنا بچپن میں نہیں دلائی جا سکتی۔ یہ اپنے ذوق، صلاحیت اور شعوری انتخاب کا معاملہ ہے، جو شعور کی عمر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مریم علیھا السلام کی پیدایش سے پہلے ان کی والدہ کا انھیں خدا کے نام پر وقف کر دینے کے واقعے سے استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ والدین کو بچوں کے کیریئر کے انتخاب کا مطلق حق حاصل ہے۔ مریم علیھا السلام کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنے پیدا ہونے والے بچے کو دین کی خدمت کے لیے خدا کے نام پر وقف کر دیں۔ قرآن مجید میں ان کی دعا اسی خواہش کا اظہار ہے[5]۔ مگر مریم علیھا السلام پر اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کی کوئی پابندی نہیں تھی جس کی خواہش اور دعا ان کی والدہ نے کی تھی۔ ایسے ہی جیسے بچپن میں طے کیے گئے نکاح کو قبول کرنے کی پابندی بچوں پر نہیں ہوتی۔ وہ شعور اور بلوغت کی عمر کو پہنچ کر رشتے سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مریم علیھا السلام کی اپنی طبیعت بھی اسی کام کی طرف مائل رہی جس کی خواہش ان کی والدہ نے کی تھی۔ یوں ان کی دعا پوری ہوئی۔

پھر یوں نہیں ہوا کہ مریم علیہا السلام کے پیدا ہوتے ہی انھیں دین کے خدّام کے حوالے کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں۔ تاہم، یہ اقدام ان کی شعور کی عمر کے بعد ہی کیا گیا ہوگا۔ اصولی طور پر اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے بیٹے اسمعیل علیہ السلام کو خدا کے لیے ذبح کر رہے ہیں تو انھوں نے اس پر من و عن عمل کرنے سے پہلے اپنے بیٹے کی رائے لی، اور بیٹے کی رضامندی کے بعد ہی اقدام کیا۔

دینی مدارس میں رائج حفظِ قرآن کی کلاس کا طویل دورانیہ بچوں پر سخت گراں بار ہوتا ہے۔ اس سرگرمی میں تنوع نہیں ہوتا کہ بچہ یکسانیت کی بوریت سے نجات پا سکے۔ زبانی یاد کرنے کی ایک ہی سرگرمی اتنے طویل دورانیے تک کرتے چلے جانا، ایک غیر صحت مند طریقۂ تعلیم ہے۔

کچھے بچوں کو اسکول سے ہٹا کر حفظ کرانے بٹھایا جاتا ہے۔ حفظ کے بعد انھیں دوبارہ سکول میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ سکول کی تعلیم کا حرج کم کرنے اور قرآن کا حفظ جلد مکمل کرانے کی خاطر بچے کا زیادہ سے زیادہ وقت حفظ قرآن میں لگایا جاتا ہے۔ اس سے بچے کا ذہنی اور جسمانی استحصال ہوتا ہے۔ اس سے بدتر پریکٹس یہ ہے کہ اسکول کے ساتھ حفظ بھی کرایا جاتا ہے۔ یوں بچے والدین کی دو طرفہ خواہشوں کے پاٹوں میں پس کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں اپنا بچپن جینے کا پورا موقع ہی نہیں ملتا۔

کم سن بچوں کا زیادہ وقت کھیل کود میں گزرنا چاہیے۔ ایسی ہر تعلیمی سرگرمی جس کے اوقات کھیل کے اوقات سے زیادہ ہوں، بچوں کا استحصال ہے۔ بچوں کی یہ عمر کھیل کھیل میں سیکھنے، خود کھوجنے اور سوالات کرنے کی ہے۔ لاابالی پن کی اس حسین عمر کو ایک سخت اور خشک روٹین کی نذر کرنا بچے کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

ایک بار یاد کر لینے کے بعد قرآن مجید کو مستقلاً یاد رکھنا ایک مسلسل محنت طلب کام ہے۔ شعبۂ حفظ سے منسلک حفاظ کسی حد تک قرآن یاد رکھ پاتے ہیں، مگر عام حفاظ جو عملی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں، ان کے لیے قرآن کو یاد رکھنا بے حد مشکل رہتا ہے۔ ان کی اکثریت بڑی عمر میں پورا قرآن یاد نہیں رکھ پاتی۔ ان کا حفظِ قرآن خود ایک یادگار بن کر رہ جاتا ہے۔

ادھر قرآن کے بھلا دینے پر بعض روایات میں وارد ہونے والی وعیدیں بھی بتائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے پورا قرآن یاد نہ رکھ سکنے والے حفاظ احساس جرم کا شکار رہتے ہیں۔ تاہم، قرآن کو بھلا دینے پر

سخت سزاؤں کی وعید بتانے والی روایات ضعیف ہیں۔ مثلاً درج ذیل روایت دیکھیے:

وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسلم: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ وَعُرِضَتْ عَلَيَّ ذُنُوبُ أُمَّتِي فَلَمْ أَرَ ذَنْبًا أَعْظَمَ مِنْ سُورَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ أَوْ آيَةٍ أُوتِيهَا رَجُلٌ ثُمَّ نَسِيَهَا» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُد (مشكاة المصابيح، 720)

[6] انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کے اعمال کا ثواب مجھ پر پیش کیا گیا، حتیٰ کہ وہ تنکا بھی جسے آدمی مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے (اس کا ثواب بھی لکھا ہوا تھا)، اور میری امت کے گناہ بھی مجھ پر پیش کیے گئے تو میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن کی کوئی سورت یا کوئی آیت عطا کی گئی اور اس نے (یاد کرنے کے بعد) اسے بھلا دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید سے بے اعتنائی برتنا بڑی محرومی کی بات ہے۔ لیکن قرآن کو زبانی یاد رکھنا دین کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

حفظِ قرآن کی حقیقت و حیثیت:

عہدِ رسالت میں متنِ قرآن کی کتابت کے ساتھ اس کی حفاظت اور اشاعت کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کا رواج تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی درپیش تھی کہ عرب معاشرت میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم تھا۔ کتابت کے ذرائع بھی عام میسر نہ تھے۔ رسم الخط بھی اس درجہ ترقی یافتہ نہ تھا کہ بغیر قراءت کے متن کی درست پڑھائی ہر ایک کے لیے ممکن ہوتی۔ قرآن مجید سب کو لکھ کر دے بھی دیا جاتا تو بھی یہ ممکن نہ تھا کہ سب اسے دیکھ کر پڑھ سکتے۔ وسیع پیمانے پر قرآن مجید کی حفاظت، تلاوت اور اس کی تعلیم و ترسیل کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

صحابہ کے ہاں بغیر سمجھے قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ عربی ان کی اپنی زبان تھی اس لیے بنا سمجھے پڑھنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ انھیں قرآن پڑھنے یا یاد کرنے کا کہا گیا تو اس سے قرآن مجید کی بے سمجھ تلاوت یا حفظ مراد لینے کی کوئی گنجایش نہیں نکلتی۔ بعد میں عجمی اقوام جب دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں، تو پہلی بار ان کے ہاں بے سمجھ تلاوت اور حفظ کا آغاز ہوا۔ قرآن مجید کے متن کی قراءت سیکھنا پہلا کام تھا۔ اس کے بعد انھیں اس کے فہم کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ کسی دوسری زبان کی کتاب پڑھنے میں یہی ترتیب اختیار کی جاتی ہے۔ مگر سستی یا بے توجہی کی وجہ سے ان کی اکثریت نے ناظرہ قرآن پر اکتفا کر لیا۔ اس کوتاہی کا جب عام رواج ہو گیا تو اس کے لیے سندِ جواز اختراع کر لی گئی۔ اِس نئے طرز کے حفظ و قراءت کو اُس تلاوت اور حفظ کا مترادف باور کرایا گیا جس کی ترغیب احادیث میں وارد ہوئی تھی۔ امام ابو بکر الطرطوشی نے بجا طور پر بے سمجھ حفظ کے اس طرز عمل کو بدعت قرار دیا ہے۔

وہ کہتے ہیں:

"ومما ابتدعه الناس في القرآن، الاقتصار على حفظ حروفه دون التفقُّه فيه۔[8]"

"قرآنِ مجید کے متعلق لوگوں کی ایک بدعت قرآن کے فہم و تفقہ کو چھوڑ کر محض اس کے الفاظ کو حفظ کرنے پر اکتفا کر لینا ہے۔"

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے اور بے سمجھے پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

{كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ}
(القرآن، 38: 29)

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے، (اے پیغمبر)، تمھاری طرف نازل کی ہے۔اِس لیے کہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور اِس لیے کہ عقل والے اِس سے یاد دہانی حاصل کریں۔

{أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا} [القرآن، (47: 24)

سو کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر اُن کے تالے چڑھے ہوئے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کر ڈالا اس نے قرآن سمجھا ہی نہیں۔

روایت یہ ہے:

لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ[9]

اس نے قرآن سمجھا ہی نہیں جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کر ڈالا۔

عجیب بات ہے کہ اس روایت کی بنا پر قرآن مجید کو تین دن سے کم میں ختم نہ کرنے کی طرح تو ڈالی گئی، مگر روایت کا اصل مقصود، یعنی بے سمجھ تلاوت کی حوصلہ شکنی، اسے باور ہی نہیں کیا گیا اور بے سمجھ تلاوت اور حفظ کو باعث اجر سمجھ لیا گیا!

قراء کے ہاں یہ طریقہ بھی اپنایا گیا کہ کسی آیت کو ادھورا نہ پڑھا جائے۔ پڑھتے ہوئے سانس درمیان میں ٹوٹ جائے تو آیت کو کچھ پیچھے سے دہرا کر اسے مکمل کیا جائے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ آیت کا ادھورا مطلب ادا نہ کیا جائے۔ مگر آیت کا مطلب ہے کیا؟ اس کی طرف التفات نہ ہونے کو بھی جائز بلکہ باعث ثواب سمجھ لیا گیا۔

ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ الف، لام، میم کی تلاوت پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ اس روایت سے بے سمجھ تلاوت و حفظ کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔[10] استدلال یہ ہے کہ الف، لام۔ میم کا معنی معلوم نہیں، پھر بھی ان کی تلاوت پر ثواب ملتا ہے۔ اس لیے بے معنی تلاوت بھی اجر کا باعث ہے۔

یہ روایت مستند نہیں۔ تاہم، اگر اس کی صحت پر کسی درجے میں اطمینان ہو بھی جائے[11] تو بھی اس کا اسلوب تلاوت کی ترغیب دینے کا ہے نہ کہ بے سمجھ تلاوت کی ترغیب دینے کا۔ الف-لام-میم کے اجر کا بیان، ثواب کا حجم بتانے کے لیے بطور مثال ذکر ہوا ہے۔ یہ بات کسی طرح معقول نہیں کہ کسی بامعنی کتاب کو بے سمجھے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ خصوصاً قرآن مجید جیسی کتابِ ہدایت کے حق میں یہ تصور بالکل بے جا ہے۔ پھر یہ ترغیب ان لوگوں کو کیسے دی جاسکتی ہے جن کے لیے قرآن مجید ان کی اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے اسے بے سمجھے پڑھنا ممکن ہی نہ تھا؟

محولہ بالا مفہوم کی تمام روایات میں سے کوئی روایت بھی سنداً صحیح یا حسن کے درجے کی نہیں کہ کسی درجے میں بھی بنائے استدلال بنائی جاسکے۔ تاہم، انھی روایات میں سے بعض متون میں وہ پوری بات بھی بیان ہوئی ہے جو دین اور عقل دونوں کے مطابق ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ اجر محض بے سوچے سمجھے تلاوت کرنے پر نہیں، بلکہ قرآن مجید پر غور و فکر کرنے، اسے سیکھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور دوسرے لوگوں کو سکھانے کے مجموعی کام پر بتایا گیا ہے۔

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

تَعلَّمُوا الْقُرْآنَ، وَاتْلُوهُ تُؤْجَروا بِكُلِّ حَرْفٍ عَشْرَ حَسَنَاتٍ، أَمَا إِنِّي لَا أَقُولُ: {الم} [البقرة: 1]، وَلَكِنْ أَلِفٌ، وَلَامٌ، وَمِيمٌ[12]"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن مجید کو سیکھو، سمجھو اور اسے پڑھو، تمھیں ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔ یاد رہے میں یہ نہیں کہتا الم (ایک حرف ہے)، بلکہ الف، لام اور میم (الگ الگ حرف) ہیں (یعنی تین حروف ہیں)۔[13]"

احادیث میں وارد ہونے الفاظ "حاملِ قرآن" اور "صاحب قرآن" کا مصداق بھی غلط طور پر اس حافظ کو قرار دے دیا گیا جسے قرآن مجید کے معنی و مفہوم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ تاہم، اس روایت میں بھی یہ القابات اس شخص کے لیے بیان ہوئے ہیں جو قرآن مجید سے اشتغال رکھتا، اس پر عمل کرتا، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے، یہ شخص ظاہر ہے کہ

قرآن مجید کو سمجھنے والا ہی ہو سکتا ہے۔

روایت یہ ہے:

لِحَامِلُ الْقُرْآنِ إِذَا أَحِلَ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ أَنْ يَشْفَعَ فِي عَشْرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتَهُ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ (المعجم الأوسط، 5258)[14]

ترجمہ: وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

فہمِ قرآن محض طبقہ علما کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ قرآن مجید کے فہم کے مختلف درجات ہیں اور ہر فرد اپنی بساط کے مطابق اس میں سے حصہ وصول کرتا ہے۔ فہمِ قرآن کا ایک دائرہ اعلی سطحی اور فنی نوعیت کا ہے، جو مخصوص علمی ذوق رکھنے والی ذہانتوں کا میدان ہے۔ تاہم، قرآن مجید کا عام فہم بھی مطلوب ہے۔ یہ تذکیر اور تزکیہ کے حصول کے لیے ہے، اور تذکیر و تزکیہ ہی قرآن مجید کا اصل مقصود ہے۔ قرآن مجید کا بیشتر حصہ اسی پر مشتمل ہے اور یہ بہت سادہ اور واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس کے لیے کسی اعلی لسانی اور علمی مہارت کی ضرورت نہیں۔

قرآن مجید کے محفوظ ہو جانے کے قابل اعتماد ذرائع میسر آ جانے کے بعد اس کی حفاظت کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کی وہ اہمیت اور ضرورت باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ تاہم، یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ رہے اور اس کے لیے حفاظ کی ایک بڑی تعداد دنیا میں موجود رہنی چاہیے، جن کی اجتماعی یاداشت میں پورا قران محفوظ رہے۔ قرآن کی حفاظت کا یہ ایسا ذریعہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اپنے ذوق اور عبادت میں حلاوت پانے کے لیے قرآن مجید جزوی طور پر یا مکمل حفظ کرنا بھی بڑی سعادت کی بات ہے۔ مگر یہ ذاتی انتخاب کا معاملہ ہے جو سن شعور سے پہلے نہیں کیا جا سکتا۔

بچوں سے قرآن حفظ کرانے کا بہر حال، کوئی جواز نہیں۔ دین کے نام پر یا آخرت کے مزعومہ تحفظ کی خاطر بچوں پر ان کی مرضی کے بغیر، ایسی مشقت مسلط کرنا جس کا حکم یا مطالبہ خدا نے نہیں کیا، ان کا استحصال ہے۔ یہ ہر گز ثواب کا کام نہیں۔۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے بچوں کو تختہ مشق بنانا زیادتی ہے اور خدا کے ہاں ہر ظلم و زیادتی کا حساب لیا جائے گا۔

حوالہ جات

01 لِحَامِلُ الْقُرْآنِ إِذَا أَحِلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ أَنْ يَشْفَعَ فِي عَشَرَةٍ مِنْ أَهْلِ بَيْتَهُ، كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ (المعجم الأوسط، 5258)

ترجمہ: وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

اسے علامہ البانیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعيف الجامع الصغير وزيادته، رقم: 4662)

اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی ضعیف ہے:

مَن قرأَ القرآنَ واستَظهرَهُ فأحلَّ حلالَهُ وحرَّمَ حَرامَهُ أدخلَهُ اللَّهُ بِهِ الجنَّةَ وشفَّعَهُ في عَشرةٍ من أهلِ بَيتِهِ كلُّهُم قَد وجبَت لَهُ النَّارُ (الترمذی: 2905)

ترجمہ: جس نے قرآن پڑھا، اسے حفظ کیا، اس کی حلال کردہ اشیاء کو حلال اور حرام کردہ اشیاء کو حرام کرتا ہے وہ اپنے گھرانے کے دس افراد جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی سفارش کرے گا۔

امام ترمذی اس کی سند کو صحیح نہیں بتاتے۔ علامہ البانیؒ نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ (ضعيف الترمذي، رقم: 2905)

02 حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ السَّرْحِ، أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، عَنْ زَبَّانِ بْنِ فَائِدٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ الْجُهَنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهَذَا؟ (مشكاة المصابيح: 2139)

معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہو گی جو تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمہارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہو گا"۔ (علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔) (مشکاۃ المصابیح، رقم: 2139)

03 {كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ} [القرآن، 74: 38]

ہر متنفس (اُس روز) اپنی کمائی کے بدلے رہن ہو گا۔

04 وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (القرآن، 2: 48)

اور اُس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اُس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ لوگوں کو کوئی مدد ہی ملے گی۔

05 إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (آل عمران، 3: 35)

اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ پروردگار، یہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اُس کو میں نے ہر ذمہ داری سے آزاد کر کے تیری نذر کر دیا ہے۔ سو تو میری طرف سے اِس کو قبول فرما، بے شک تو ہی سمیع و علیم ہے۔

06 قال حافظ زبیر علی زئی: إسنادہ ضعیف، رواہ الترمذي (2916 وقال: غریب) وأبو داود (461)۔ ابن جریج مدلس ولم یسمع من مطلب شیئًا والمطلب: لم یسمع من سیدنا أنس رضي اللہ عنہ.

https://islamicurdubooks.com/ur/hadith/hadith-.php?bookid=23&hadith_number=720

وعن سعد بن عبادة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ما من امرئ يقرا القرآن ثم ينساه إلا لقي الله يوم القيامة اجذم.(رواه ابو داود والدارمي)

سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص قرآن پڑھتا ہو لیکن پھر وہ اسے بھول جائے تو وہ روز قیامت حالت کوڑھ میں اللہ سے ملاقات کرے گا۔“

قال حافظ زبير على زئي :إسناده ضعيف، و أبو داود (1474) و الدارمي (437/2 ح 3343) يزيد بن أبي زياد: ضعيف و عيسي بن فائد: مجهول، ولم يسمعه من سعد، بينهما رجل مجهول

https://www.islamicurdubooks.com/hadith/hadith.php?hadithnumber=2200&bookid=23&tarqeem=1

07 مالکی فقیہ اور حافظ، التوفی: 250 ھجری

08 ابو بكر الطرطوشي، الحوادث والبدع، ناشر: دار ابن الجوزي، الطبعة: الثالثة، 1419 هـ 1998 م، ص: 101

09 ترمذی، رقم: 2949، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے

علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (صحيح وضعيف سنن الترمذي، 2949)

10 مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ، وَالحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، لَا أَقُولُ الم حَرْفٌ، وَلَكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ۔(سنن الترمذي، 2910)

امام ترمذی نے اس حسن صحیح غریب قرار دیا ہے۔ علامہ البانی نے اسے صحیح بتایا ہے (صحيح وضعيف سنن الترمذي، 2910)۔ تاہم، اس کی سند پر کلام قابل لحاظ ہے جو آگے آتا ہے۔

11 یہ مضمون کل دو صحابہ سے مروی ہے، ایک عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، دوسرے عوف بن مالک الاشجعی۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے محمد بن کعب روایت کرتے ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود کا انتقال 33 ہجری میں ہوا اور محمد بن کعب کی پیدائش 38 یا 40 ہجری کی ہے، لہذا دونوں میں لازماً انقطاع ہے اِس لیے اس سند سے منقول ساری روایات ضعیف ہیں۔ (التفسير من سنن سعيد بن منصور - محققا (29/1)

عوف بن مالک ایک دوسرے صحابی ہیں، اُن سے بھی محمد بن کعب ہی روایت کرتے ہیں، یہاں انقطاع کا مسئلہ نہیں کیونکہ عوف بن مالک کی وفات 73 ہجری میں ہوئی ہے، لیکن اِس سلسلے کی تمام روایات ایک دوسرے راوی، موسیٰ بن عبیدۃ الربذی کے باعث شدید ضعیف ہیں۔ (الذهبي، ديوان الضعفاء، رقم: 4293، ص: 402)۔ مثلاً دیکھیے، مصنف ابن ابی شیبۃ، رقم: 29933

12 التفسیر من سنن سعید بن منصور–مخرجا، 1/ 35، ص 6

13 مستفاد از تحقیق جناب محمد حسن الیاس، ""قرآن مجید کی تلاوت، ہر لفظ پر دس نیکیاں"
https://www.facebook.com/100064626491667/posts/1889002831463250/

14 علامہ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔(ضعیف الجامع الصغیر وزیادتہ، رقم:4662)

ثوبیہ نورین

گفتگو بدلیے: اپنی زندگی کے لیے

ہم اپنی زندگی کی مشکلات کے کتنے ذمہ دار ہیں؟ ان مشکلات کو ختم کرنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیا کوئی قابل عمل حل ہے؟ ثوبیہ نورین کی یہ منفرد اور مشقی تحریر چند تجویزیں لیے ہوئے ہے۔ یہ تجاویز آپ کو حیران اور چونکا دیں گی!

شمع گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ آخر ایسا کیا ہو جس سے لوگ اپنی حیثیت اور اپنے کردار کی طاقت کو پہچان سکیں۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے دماغ میں آج کے دن کے سب واقعات آنے لگے۔ اسی اثناء میں اس کے خاوند نے اسے مخاطب کیا: "آج کن سوچوں میں گم ہے میری بیگم؟"

"اوہ۔۔۔آپ پہنچ بھی گئے۔۔۔کچھ نہیں بس وہی روز کے قصے!"

"چلیں آپ بھی فریش ہو لیں کھانا کھاتے ہیں۔۔ پانچ منٹ بعد۔" دونوں کھانے کی میز پر۔ بیٹھے ڈسکشن میں مصروف تھے۔ شمع اور عاصم ہر روز اپنے دن کی روٹین ایک دوسرے سے شئیر کرتے تھے اور وہ دونوں نہ صرف اپنی زندگی کو خوبصورت بناتے تھے بلکہ ان کے حساس مزاج اور محبت کے باعث وہ لوگوں کو امپاور کرنے، اپنی خامیوں اور غلطیوں کو اون کرنے کا ہنر بھی دیتے مگر اس انداز میں کہ لوگ خود

اپنی زندگی، اپنے جملوں اور اپنی ذمہ داریوں اور ان کی جوابدہی کے بارے میں سوچنے والے بنیں۔ اس سلسلے میں وہ دونوں اکثر اپنے سٹاف کی فرمائش پر چھوٹے چھوٹے میسج کارڈز اور پمفلٹس ڈیزائن کرتے۔

کچھ سال پہلے ان کی لوگوں سے فرسٹریشن پر مبنی بحثیں ہوتی کہ ہم لوگ گھروں اور آفسز میں بیٹھ کر واویلے کرتے ہیں کہ ملک کے برے حالات ہیں۔ لوگ کرپٹ اور کام چور، خائن ہیں۔ لوگ بے حس ہیں۔ ملاوٹ اور مہنگائی ہے۔ سکول ٹیچرز، والدین ایک دوسرے کی نظر میں غافل ہیں۔ سسٹم میں بگاڑ ہے۔ سب کو دوسروں کی تو ذمہ داریاں پتہ ہیں مگر اپنی غلطی کی نشاندہی کوئی نہیں کرتا۔ یہ ہم نے کیسی تعلیم پائی ہے کہ دوسروں کے صرف فرائض اور اپنے صرف حقوق یاد رہتے ہیں۔

لہذا انہوں نے گفتگوؤں کی تہہ میں جا کر تجزیہ کرنا سیکھا اور چھوٹی چھوٹی موثر کاوشوں میں مصروف رہتے۔ شام کی چائے پر وہ دونوں اپنے پمفلٹ کے مواد جمع و مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ آج کے پمفلٹ کا نام تھا:

"گفتگو بدلیے"

صبح سات بجے سے چار بجے تک جو جو جملے، ان دونوں نے سنے، وہ لکھتے گئے۔ ان کے خیال میں یہ جملے کسی اور طرح سے بولے جانے چاہیے۔ کیونکہ ہر جملہ جیسے لوگوں نے بولا، اس میں ان کو یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ خود کچھ نہیں کر رہے۔ اس تبدیلی کے بعد پمفلٹ کی تحریر کچھ یوں تھی۔

"کیا آپ کے حالات خود بخود بگڑ رہے ہیں یا روزمرہ کی سیچوایشنز میں آپ کا بھی کوئی کردار ہے؟"

"اگر تو سب خود بخود ہوتا ہے یا آپ کے بس اور کنٹرول سے باہر ہے تو پھر تو واقعی، آپ کی ذمہ داری ختم! کیونکہ آپ کا تو کردار ان سیچوایشنز میں ہے ہی نہیں۔ اسی لیے جب ذمہ داری نہیں تو جوابدہی کا احساس بھی نہیں۔ لیکن اگر روزمرہ کی صورتحال میں آپ کا ارادہ و اختیار بھی شامل ہے تو یقیناً آپ اپنے حالات اور اقدام کے لیے خدا کے ہاں جوابدہ ہیں۔

"آیئے خود کا محاسبہ کریں اور سوچنے کو تیار ہوں۔ اگر ہم لوگ یہی جملے بولتے رہے تو کبھی کوئی خود کو بدلنے کو تیار نہیں ہو گا بلکہ ہر خرابی اور کوتاہی کا ذمہ دوسروں پر یا حالات ہی پر دھرے گا۔ لہذا اپنی ذمہ داری پہچانئے اور اپنے جملے بدلئے۔

- اس ٹریفک رش میں بندہ کیسے ٹائم پہ پہنچے۔ یا

ٹریفک رش کو بھانپنے کے باوجود میں اپنے سفر کرنے کا وقت تبدیل نہیں کر رہا۔

روز ٹریفک کے رش آور ز جاننے کے باوجود میں اسی وقت نکلتا ہوں

آج بچوں کی وین چھوٹ گئی اور لیٹ ہو گئے۔

میں لیٹ سونے کے باعث صبح اٹھی نہیں اور یوں بچوں کی گاڑی نکل گئی۔ اور وہ لیٹ پہنچے۔

- زمانہ ہی ایسا ہے کہ نیکی انسان کر ہی نہیں پاتا

میں اس زمانے میں، میں نیکی کرنے کو مشکل سمجھتا ہوں

نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا

فی زمانہ، نیکی کرنے کی قیمت دینے کو میں تیار نہیں ہوں

ایک لاکھ کی تنخواہ میں گزارا مشکل ہی ہونا ہے ناں

میں نے اپنے اخراجات اپنی تنخواہ سے بڑھا رکھے ہیں۔ اور نہ اخراجات کم کرنے کو تیار ہوں نہ وسائل بڑھانے کو

- سڑکوں بازاروں میں صفائی نہیں رہ سکتی

ہم سڑکوں بازاروں کی صفائی نہیں رکھتے۔ نہ صفائی کرنے اور رکھنے کو اہمیت دیتے ہیں

میں اپنے ہذبینڈ سے گفتگو شروع ہی نہیں کر پاتی

میں اپنے ہذبینڈ سے گفتگو کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ٹینشن کا سامنا نہیں کرنا چاہتی

- میری بیوی بے وقت بات کر کے مجھے غصہ چڑھا دیتی ہے

میری بیوی مجھے بات بات پہ غصہ چڑھاتی ہے

میں اپنے دماغ میں سوچے بیٹھا ہوتا ہوں کہ میری بیوی کو کسی اور وقت بات کرنی چاہیے۔اور اگر بیوی کو وہ وقت معلوم نہ ہو اور وہ بات کر دے میں یکدم بھڑک کر بات کرتا ہوں، غصہ کرتا ہوں

آج دودھ ابل گیا

میرے نہ دیکھنے کے باعث دودھ ابل گیا

مجھے باس کچھ بھی کہہ دیں تو مجھے ٹینشن ہو جاتی ہے

میں باس کی باتوں کو یہ درجہ دیتا ہوں کہ وہ مجھے بالکل ٹھیک جج کر سکتے ہیں اور میں، اپنی کام کی نوعیت اور وجہ جاننے کے باوجود اپنے باس کی ڈانٹ کو زیادہ اہم گردانتا ہوں اور سیلف ڈاوٹ کرنے لگتا ہوں

میں انسانوں کی رائے، اپنے بارے میں اتنی سچ سمجھ لیتا ہوں کہ میں اپنے دماغ اور صلاحیتوں پہ شک کرنے لگتا ہوں

مجھے تو گھریلو حالات کی وجہ سے ڈیپریشن ہو گیا

میں نے گھریلو حالات کو نہ سمجھنے کے باعث، اپنے سوچنے کی صلاحیت پر کام نہیں کر رہا، یا تعمیری انداز میں سوچنے کو تیار نہیں ہوں

گرمی کی وجہ سے میرا تو میٹر گھوم گیا اور بچوں کو ڈانٹ پڑ گئی

میں نے موسم کی شدت کو اس قدر اپنے اوپر حاوی کیا کہ اپنے بچوں پہ غصہ نکالا

لڑکے تو ہوتے ہی شرارتی ہیں۔

ہم لڑکوں کے مخصوص مزاج کو درست مانتے ہیں

جوانی میں تو ہر بچے سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ لڑکے الٹی سیدھی حرکات کر جاتے ہیں

ہم اپنے لڑکوں کی تربیت اس انداز میں کرتے ہیں کہ وہ اپنے اقدام کے بارے میں زیادہ سوچتے سمجھتے نہیں اور بے پروائی کا رویہ برتتے ہیں

- اس معاشرے میں اکیلی عورت کی عزت محفوظ رہنا بڑا مشکل ہے

ہم اکیلی عورت کے آگے ڈھال بننے کو تیار نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ / ہم اکیلی عورت کو کمزور سمجھ کر اس کی حفاظت نہیں کرتے

ابو پرچہ اتنا مشکل تھا کہ اس لیے فیل ہو گیا

میں اپنی پڑھائی ایسے نہیں کرتا کہ مشکل اور مختلف سوالوں کے جواب دینے کے قابل ہو جاوں

- امی، میرا فٹ بال پھر گم ہو گیا

امی، میں اپنے فٹبال کی حفاظت نہیں کرتا اور ایک بار پھر میں نے گما دیا

میرے اتنے وسائل نہیں کہ آپ کو قرضہ دے سکوں

میں اپنے محدود وسائل میں اپنی ضروریات کو ترجیح دیتا ہوں اس لیے آپ کو قرضہ نہیں دوں گا یا

میں اپنے محدود وسائل میں سے اپنی ضروریات کو پورا کرنا زیادہ اہم سمجھتا ہوں

- آج کل کے بچے، اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ کسی بڑے کا حکم نہیں مانتے ہیں، اس لئے ان پر شیر کی نگاہ رکھنی پڑتی ہے

ہم آج کل کے بچوں کے مسائل کو سمجھنے کو تیار نہیں

اس لئے ان کی ہر بات اور مطالبہ کو غلط سمجھتے ہیں/یا

اس بات سے چڑتا ہوں کہ میری بات کے مقابل اپنی رائے رکھیں۔ یا

ہم بچوں کے الگ انفرادی وجود کو ماننے کو تیار نہیں۔ اس لیے اپنا ماتحت رکھنے کے لئے ان کو ڈراتے ہیں

ایک میری ایمانداری سے معاشرہ نہیں بدلے گا

میں اپنے عمل میں اپنے حصے کی ایمان داری کو ضروری نہیں سمجھتا

عورتیں کمزور ہی ہوتی ہیں۔ ان کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے

ہم اپنی بیٹیوں کی تربیت بچپن سے ہی یہ بتا کر کرتے ہیں کہ وہ کمزور ہیں۔ اس لیے کسی کا سہارا اور

تحفظ لے کر جیئیں۔

زیادہ مصروفیات آجائیں تو میری نمازیں رہ جاتی ہیں

مصروفیات کے آنے پہ میں اپنے کام کو ختم کرنے کو ترجیح دیتی ہوں، نماز کو نہیں
ان جملوں کو بدلنے سے آپ اپنی زندگی کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے سکتے، اور تب ہی آپ اپنی ذمہ داری کو پہچان کر، اپنے حصے کا کام کرنا شروع کریں گے۔

محمد وقاص رشید

ممتا کا راج: ارشد اور نیرج کی ماؤں کے نام

ہمارے خطے میں نفرت ایک سیاسی و مذہبی کاروبار ہے۔ نفرتوں کے سوداگروں نے تقسیم ہند سے لے کر آج تک ایک کام بہت کامیابی سے کیا ہے۔ انھوں نے محبت پر ضرب لگا کر پیار کو منفی کر کے، امن پر انسانیت کو جمع ہونے نہیں دیا۔ یہی نفرت و حقارت ان تاجروں کا حساب و ریاضی ہے۔ کم علمی کی گود سطحی جذبات کی بہترین آماجگاہ ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں جذباتی افراد بکثرت میسر ہو جاتے ہیں جو اس بیوپار کا ایندھن بنتے ہیں۔ علم گہرائی لے کر آتا ہے۔ ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔ انسان میں تدبر کی اہلیت پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے تو ان سوداگروں کی دال نہیں گلتی۔

ارشد ندیم نے ایک جیولن کی نوک پر ساری قوم کو اکٹھا کر دیا۔ یہ ان کا بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایک مضمون میں لکھا تھا کہ خوشیوں کے صیاد نے ہم سے اجتماعی خوشیاں چھین لیں۔ ارشد نے اپنے زورِ بازو سے مدت بعد ایک قومی مسرت کا اہتمام کیا۔ مبارکباد تو بنتی ہے۔

مگر مجھ طالب علم کی نظر میں اس خطے میں اصل اولمپکس مقابلہ اس کے بعد شروع ہوا۔ جن دو ماؤں کے بیٹے اولمپکس 2024 میں جیولن تھرو کے فائنل مقابلے میں شریک تھے، وہی اس مقابلے کا حصہ بنیں۔ نیرج کو ملا چاندی کا تمغہ تو ارشد نے اولمپکس میں پاکستان کے لیے واحد طلائی تمغہ جیت کر مدت کے بعد کوئی اجتماعی خوشی قوم کو عطا کی۔ مگر اصل مقابلہ ان دونوں ماؤں نے جیتا۔

کیمرہ اور مائک جب نیرج کی والدہ محترمہ کے پاس تاثرات کی جانکاری کے لیے پہنچا تو کہنے لگیں:

"ارشد بھی میرا ہی بیٹا ہے اس نے اپنی محنت سے سونے کا تمغہ جیتا۔ اسے مبارک ہو"۔

اسکے بعد جب یہاں پر ارشد کی والدہ محترمہ کی باری آئی تو کہنے لگیں: "نیرج میرے بیٹے کا دوست ہے۔ میں اس کے لیے اللہ سے دعا کرتی ہوں۔ اگلی بار اسے سونے کا تمغہ ملے"۔

دو ماؤں نے نیزے اٹھائے اور سرحد نام کی سرخ لکیر کے دونوں اطراف زمین پر سیاسی بیوپار کے لیے بکھری پڑی عصبیت، نفرت اور حقارت کو اپنے اپنے نیزے کی انی پر پرویا اور اتنی دور پھینکا کہ یہ مائیں اپنے بیٹوں سے بھی آگے نکل گئیں۔ ان دونوں میں سونے چاندی کا فرق انسانیت کی توہین ہے۔ دونوں ماؤں کو قدرت نے سونے کے میڈلز سے نوازا اور وہ میڈلز ظاہری نہیں باطنی ہیں۔ وہ میڈلز ان کے دل ہیں۔ انکے خوب صورت دل۔

کاش کہ اس خطے میں ان ماؤں کی حکمرانی ہو۔ ان کی ممتا کا راج ہو۔ ان کے فلسفے کی حکومت ہو۔ سرحد بیچ میں ایک انتظامی لکیر ہو تو ہو، دلوں کے درمیان نفرتوں کی لکیریں نہ ہوں۔ سوچوں میں بغض و عناد کی دیواریں نہ ہوں۔ انسانی رویوں میں عصبیتوں کے بند نہ ہوں۔ یہاں کھیلوں کے مقابلے ہوں۔ جنگوں کے نہیں۔

ذرا تصور کیجیے کہ ان دو عظیم ماؤں کے فلسفے سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے ذریعے سے نیزوں کی انی پر غربت، جہالت، شدت پسندی، بھوک، افلاس اور احتیاج پر پرو کر اتنی دور پھینک دیا جائے کہ یہ خطہ انسانیت، محبت، پیار اور امن و آشتی کا ایک گہوارہ بن جائے۔ یہاں دونوں اطراف کی

مائیں دونوں اطراف کے بیٹوں، بیٹیوں کے بارے میں کہیں کہ وہ بھی ہمارے ہی بچے ہیں۔اور یہ فلسفہ ان کی تربیت کے ذریعے سے یہاں کے بیٹوں بیٹیوں کے ذہنوں میں راسخ ہو جائے۔ کسی نے خوب لکھا کہ "اگر یہاں کی حکمرانی ماؤں کے پاس ہو تو یہاں کبھی جنگیں نہ ہوں"۔۔۔ان ماؤں کو سلام۔ان کے فلسفے پر ایک نظم۔۔۔۔۔

ممتا کا راج

نیرج کی ماں نے یہ کہا
ارشد بھی ہے میرا بیٹا
ارشد کی ماں نے بولا
نیرج بھی ہے لعل میرا
نیرج نے اور ارشد نے
بے شک جیتے ہیں تمغے
اپنی اپنی ملت کو
یہ اعزاز جی ہیں بخشے
پر دونوں کی ماؤں نے
ان کی خوب دعاؤں نے
نفرت کے ان نیزوں کو
پھینک کے بیٹوں سے بھی دور
روشن شمعِ الفت کر کے

دے کے محبت کا اک نور
قسم سے دل ہی جیت لیا
کیا ہی معرکہ سر ہے کیلا
کاش ہمارے خطے پر
دھرتی کے اس حصے پر
ان دو ماؤں کا ہو راج
ان کے سر پر ہو یہ تاج
امن کی خاطر کبھی زمیں
اس خطے میں تنگ نہ ہو
یہاں پہ کوئی جنگ نہ ہو
یہاں پہ کبھی جنگ نہ ہو

افسانہ

نعیم احمد بلوچ

سوالوں کا جنگل

مجھے تسلیم ہے کہ ایسے کانٹے دار سوال کسی نے نہیں کیے تھے۔ پہلے کبھی اس محاورے کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ دانتوں پسینہ آنا کیا ہوتا ہے مگر آج اس کے سوالوں سے آگیا تھا۔ لیکن میں بھی کیا کرتی، جو کچھ سنا، پڑھا اور سوچا سمجھا، اس کے مطابق ہی ذہن بنا ہوا تھا۔ لیکن اس کم بخت نے ایسے ایسے پہلو نکالے کہ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور اگر پاؤں کے کوے ہوتے تو وہ بھی اڑ جاتے۔

لیجیے میں مزید کسی سنسنی کا اضافہ کیے بغیر بتائے دیتی ہوں۔ میں درسِ قرآن دیتی ہوں۔ چند برسوں سے یہ عمل چل رہا تھا۔ درس کے آخر پر کبھی کوئی سوال بھی پوچھ لیا جاتا تھا۔ آج کے درس میں ایسی آیات تھیں جن میں جنت کی نعمتوں کا ذکر تھا۔ حضرت ابراہیم کا ذکر تھا، وہ بھی ضمناً۔ پہلی دفعہ آئی ایک لڑکی نے ہاتھ کھڑا کیا تو میں نے اجازت دی۔ بولی:

"میڈم، مردوں کے جنت پر خوش ہونے کی کوئی وجہ بنتی ہے کہ وہاں عیاشیوں اور بدمستیوں کی خوب اجازت ہو گی مگر آپ؟ زیادہ سے زیادہ اس 72 کے "ریوڑ" میں پہلا یا دوسرا نمبر بھی آپ کا ہوا تو بھی کیا کریں گی۔۔۔ کتنے دنوں بعد باری یا وکھری ٹائپ کا جوائنٹ فیملی سسٹم۔۔۔؟ نہ کام، نہ کاج، کھانا پینا، پینا اور کھانا۔۔۔ جنسی عمل اور بس؟ آپ تو پلاسٹک کی ایک روبوٹ ہی ہوں گی!"

وہ لمحے بھر کو رکی اور پھر بولنے لگی: "یہاں کوئی اسلام پر عورت کے حوالے سے اعتراض کرتا ہے کہ اس میں عورت کی تحقیر ہے تو ماں کی مثال دی جاتی تھی، وہاں تو وہ بھی نہیں ہو گی۔ نہ کوئی رشتہ نہ کوئی ناتا۔ وقت گزارنے کو نہ کوئی فلم نہ کوئی ڈراما۔۔۔ وہ بنے بھی کیسے وہاں۔۔۔۔ سارے ایکٹر اور ایکٹرس، گانے بجانے والے اپنے اپنے سازوں کے ساتھ جہنم میں سڑ رہے ہوں گے۔ اور آپ بس۔"
اس کے بعد اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جنت کا صاف مذاق اڑا رہی تھی۔ اور اس کے سوال کے بعد مجلس میں ایک منحوس سی خاموشی چھا گئی تھی۔

میری تو کھوپڑی چیخ گئی اس کے سوال سے۔ تن بدن کو آگ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے غصے کو قابو پا کر صرف یہ کہہ سکی:

"جنت و دوزخ کا بیان امور متشابہات میں سے ہے۔۔۔ ہم یہاں ان کو سمجھ نہیں سکتے"

"ہاں اب ایک سو چالیس فٹ لمبا ہونا کیسے سمجھ میں آئے۔۔۔۔ اور 72 کا مطلب 72 ہی ہے یا ریاضی بھی وہاں مختلف ہو گی؟"

اب تو میری قوت برداشت بالکل ہی ختم ہو رہی تھی مگر اس کی لمبی زبان چھوٹی نہیں ہو رہی تھی بولی:

"اچھا آپا۔۔۔۔ عورتوں میں سب سے زیادہ آزمایش تو شاید اماں حاجرہ کی ہوئی نا۔۔۔ حضرت ابراہیم اسے اور اس کے دودھ پیتے بچے کو تپتے صحرا میں اکیلے چھوڑ کر چلے گئے۔۔۔۔ اب بھگتا حاجرہ نے۔۔۔ دوڑیں تو ان کی لگیں مگر انعام سارے ابراہیم کو ملے؟ ان کو کیا ملا؟ کیا ہی اچھا ہو کہ جنت میں ابراہیم کے بجائے انھیں۔۔۔۔".

میں بھانپ گئی کہ وہ کیا قیامت ڈھانے والی ہے۔ میں حلق کے بل چیخی: "پکڑو اس گستاخ کو، نابکار سلمان رشدی کی کچھ لگتی۔۔۔۔"

میرا خیال تھا کہ وہاں بیٹھی خواتین اسے دبوچ لیں گی۔ مگر وہ بے چاری جب تک اپنی چادریں اور برقعے سنبھالتیں، وہ کسی ہرنی کی طرح اٹھی اور اچھلتی پھدکتی بھاگ گئی۔ اس نے صرف ایک شرٹ، جینز اور ہلکا سا دوپٹا سر پر اٹکایا ہوا تھا۔

وہ جس خاتون کے ساتھ آئی ہوئی تھی وہ بے چاری تو تھر تھر کانپنے لگی: "آپا معافی چاہتی ہوں، یہ ڈنمارک سے آئی ہے۔ ہمیں تنگ کر رہی تھی الٹے پلٹے سوال کر کے۔ میں نے سمجھا کچھ سنے گی آپ سے تو اثر لے گی۔۔۔"

میں نے غصے سے کہا: "کیا اس کے ماں باپ اسے سلمان رشدی کی کتابیں پڑھنے کو دیتے ہیں؟"

"نہیں جی۔۔۔ وہ جو چاہتی خود ہی پڑھتی ہے۔۔ یورپ سے ہے نا۔۔۔۔ اس کے ماں باپ بھی بہت عاجز ہیں اس سے"۔

اتنی دیر میں باہر سے پاں پاں کی آوازیں آنے لگیں۔ دانش کے ابا لینے آ چکے ہیں۔ تین مسلسل ہارن بج چکے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ جلدی میں ہیں اور میں ان کا غصہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ فوراً باہر بھاگی، حالانکہ ابھی چائے آنا باقی تھی۔ مگر میں تو بھئی خاوند کی فرماں بردار ہوں، فوراً یہ کہہ کر باہر کو لپکی کہ آئندہ ایسی بد تمیز لڑکیوں کو درس میں نہ لایا جائے۔

گاڑی میں قدم رکھا تو راشد کا موڈ بہت خراب معلوم ہوا۔ اصل میں اس کا موڈ تو تین برسوں سے خراب تھا۔ کہانی لمبی ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری لو میرج ہے۔ یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھے۔ میں بڑی موڈ سکوڈ تھی۔ سچی بات ہے راشد نے اسی لیے پسند کیا تھا۔ مگر جب میرے اوپر تلے دو مس کیرج ہو گئے تو مذہب کی طرف چلی گئی۔ میرے سسر ہی لے گئے تھے مجھے آپا فرحانہ کے پاس۔ اس وقت میں تیسری دفعہ پر گہبٹ تھی۔ اور مہینہ بھی آخری تھا۔ انھوں نے مجھے کہا کہ جتنے دن ڈلیوری میں رہ گئے ہیں یہ وظیفہ کرنا ہے اور یہ تعویذ باندھنا ہے، وہ بھی خاص جگہ پر۔ بچہ ٹھیک ہوا تو واپس میرے پاس آ جانا۔ اور جب دانش ٹھیک ٹھاک پیدا ہو گیا تو میں تو سوا مہینہ نہا کر آپا فرحانہ کی مریدنی بن گئیں۔ اور پھر تین برس ان کے پاس رہ کر ان کے رنگ میں رنگی گئی۔ اور ان کا رنگ کیا تھا؟ بے رنگ ہو جانا۔ کہاں کٹے بالوں اور فٹ لباس میں اٹھکیلیاں کرتے چلنے والی انیقہ اور کہاں اب برقع پوش، لپ اسٹک سے بھی بے نیاز اللہ کی نیک بی بی۔ اور بقول راشد۔۔۔ اللہ میاں کی گائے! بس اس دن کے بعد میرا شوہر روٹھ گیا مجھ سے۔ وہ اسی انیقہ کی تلاش میں تھا اور میں نے اپنے آپ کو آپا فرحانہ کے آگے فروخت کر ڈالا تھا۔ میرا سسرال میرے ساتھ تھا۔ سسر نے کہا: بیٹا، اگر تم نے دین چھوڑا تو اللہ وہ لے جائے گا جو اس نے تمھیں دیا ہے۔ رہا راشد تو اسے میں سنبھال لوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا دین کی طرف آنا خوف کی وجہ سے تھا۔ ذہن میں سوال آتے رہتے تھے لیکن میں لرز جاتی کہ اگر دانش چھن گیا تو۔۔۔۔ بس اسی عدم تحفظ نے مجھے "اسلامی راہبہ" بنا ڈالا تھا۔ اور چار برسوں سے یہ معاملہ چل رہا ہے۔ پھر اس کے بعد مجھے کوئی پریگنینسی بھی نہیں ہوئی۔ اب میں بھلا اکلوتے دانش کا رسک کیسے لے سکتی تھی!

میں انھی سوچوں میں تھی کہ راشد بول پڑا: "تم نے آج آپا فرحانہ کی چاچی کی ممانی ساس کے ختم پر جانا ہے نا؟"

راشد کی عادت تھی کہ وہ اسی طریقے سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا اور مجھے چڑاتا تھا ورنہ وہ

سیدھے طریقے سے بھی کہہ سکتا تھا کہ تم نے آپا فرحانہ کی دادی کے ختم پر جانا ہے؟ خیر۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا : "نبیل یو کے جا رہا ہے اور آج اس نے اپنے گھر میں پارٹی رکھی ہے۔ میں تمہیں ختم والی جگہ پر چھوڑ کر پارٹی میں چلا جاؤں گا۔۔۔ ٹھیک ہے؟"

نبیل کو معلوم تھا کہ میں اس طرح کی پارٹیوں کی کتنی شوقین تھی۔۔۔ جہاں پر ڈھیر سارا ہلّہ گُلّہ ہوتا ہے لیکن میں اب دنیا تیاگ چکی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اب بھی پلٹ سکتی ہوں۔ لیکن کاش وہ پگلا سمجھے کہ ماں کی کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ خیر۔۔۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ مجھے راستے میں چھوڑ دیجیے گا۔

راشد کی بات سے میں اس لڑکی کے سوالات کو ذہن سے جھٹک سکتی تھی لیکن میں ابھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اس بد تمیز کے سوالوں پر غصہ آ رہا تھا۔ میری جھنجھلاہٹ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں جان چکی تھی میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ سوال کرنا سکھلایا ہی نہیں گیا تھا۔ جواب کیسے ملتے۔۔ خیر۔ میں اسی طرح پروگرام کے مطابق آپا فرحانہ کی دادی کے ختم پر گئی۔ وہاں پر کئی گھنٹے پروگرام چلتا رہا۔ بہت ڈسٹرب رہی۔ یہ ڈسٹربنس کیسی تھی، میں عقلمند ہوتی کہ اس کا تجزیہ کر پاتی تو اتنی بزدل ہی کیوں ہوتی۔ بس اسی روٹین میں رہی۔ پروگرام کے مطابق راشد نے مجھے وہاں سے پک کیا۔ دانش راشد کے ساتھ ہی تھا۔ یہ بھی میرے اندر کا عجیب تضاد تھا۔ میں دانش کو اپنے رنگ میں رنگنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ جانے میں کیوں چاہتی تھی کہ وہ راشد کی طرح بنے۔۔۔ دنیا کی ترقی میں آگے جائے۔ کھیلے کودے اور زندگی کے رنگوں سے لطف اندوز ہو۔

خیر تھک ہار کر گھر آئی۔ کھانا وانا کیا پکانا تھا، وہاں سے ہم دونوں اپنی اپنی قسمت کا کھا کر آئے تھے۔ راشد بہت کچھ بتا رہا تھا کہ وہاں یہ ہوا، وہ ہوا اور میں "ہوں، ہاں" کرتی رہی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان سوالوں سے ابھی تک نہیں نکلی تھی۔ رات اس طرح کی نہیں تھی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ بہت تھک چکی تھی۔۔ جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ پھر یوں لگا کہ اٹھ بیٹھی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ آسمان ہے مگر وہ قوس قزح کے رنگوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا آسمان اور ایسے رنگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے ۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ مثال سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بتانے کو تو بتا دیا کہ رین بو، مگر وہ رنگ بڑے نرالے تھے ۔ آس پاس کا منظر، لش گرین مگر سبزہ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے؟ ٹھیک ہے کہ وہ سبزہ تھا ، گریزی تھی۔ مگر نہیں۔ وہ سبزہ نہیں تھا۔ وہاں پھول تھے لیکن وہی بات، بس پھولوں جیسے تھے۔

پھول کبھی ایسے نرالے اور خوش رنگ نہیں ہوتے ! کیا نرالا کمبی نیشن تھا ! کس کی مثال دوں۔۔۔ میں ابھی ایک عالمِ تحیر میں تھی کہ ایک آواز سنائی دی:

"بھئی میں تو بہت مصروف رہی۔۔ آج سوچا کہ کچھ تفریح ہو جائے۔۔ میری تو کام کر کر کے طبیعت ہی بہت اچاٹ ہو گئی ہے۔ پراجیکٹ ہی میں نے ایسا لے لیا۔ اس زمین یعنی ارتھ کے بننے سے لے کر قیامت کے دن تک۔ معلوم ہے کتنی گھنٹے بنتے ہیں؟ بے شمار۔ مجھے ان کی ساری کی ساری ریکارڈنگ دے دی گئی اور یہ اصل میں میرا ہی آئیڈیا تھا۔ اس سب کاٹھ کباڑ سے ان اہم اور دل چسپ واقعات کو الگ کرنا جن کے بارے میں ہم انسان دنیا کی زندگی میں الجھے رہے، دعوے کرتے رہے کہ یہ ہوا، وہ ہوا۔ وہ سچا، وہ جھوٹا وغیرہ"

"ہاں مجھے یاد ہے تم نے ہی تو پوچھا تھا کہ اگر مسیح علیہ السلام کو صلیب نہیں دی گئی تھی تو پھر کیا ہوا تھا؟"

"اور میں نے ایک فرشتے سے سوال کیا تھا کہ یہ ارتقاء کی اصل کہانی کیا ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا کہ وہ اسامہ بن لادن نائن الیون کی دہشت گردی میں ملوث تھا کہ نہیں؟ آخر کیسے انھوں نے یہ سب کچھ کر لیا؟"

میں نے بولنے والوں کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے دیکھے بھالے لگے۔ اوہ! ایک تو مدر ٹریسا تھی اور دوسری رُتھ فاؤ۔ اور تیسری شاید میری کیوری اور چوتھی مجھے بلقیس ایدھی لگ رہی تھی۔"

میں تو حیران رہ گئی۔ یہ لوگ یہاں؟؟ یہ سوال آتے ہی میرے ذہن میں یوں لگا جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو۔ "یہاں مذہب ہی کی بنیاد پر نہیں، فطرت میں رکھی اقدار کی پاس داری پر بھی انسانوں کو نوازا گیا ہے!"

میرے دل میں بڑی خواہش پیدا ہوئی کہ میں ان سے بات کروں۔ ان سے پوچھوں کہ مجھے بتاؤ ہاجرہ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ مجھے اس کی ریکارڈنگ دکھاؤ۔ اصل میں میرے اپنے ذہن کے سوال جاگ پڑے تھے۔ لیکن جیسے میں نے ان کی طرف قدم بڑھایا۔ عجیب احساس ہوا۔ وہ سب میری موجودگی سے

بالکل ناواقف تھیں مگر میں انھیں صاف صاف دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی۔"

سب سے پہلے بولنے والی مدر ٹریسا تھی۔ کیا حسین خاتون! وہی نین نقش لیکن اب ان میں بلا کا حسن تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ سانچا تو وہی ہے لیکن اس کے سارے عیب، ساری کمیاں دور ہو چکی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھی: "ہاں بھئی مجھے اس پراجیکٹ کے لیے فرشتوں کی جو ٹیم دی گئی تھی، انھوں نے میری نگرانی میں بڑی محنت کی۔ ہم نے کروڑوں کی تعداد میں فلمیں ایڈٹ کر لی ہیں۔ اور ان کی نمایش کی جا رہی ہے۔"

"مگر اب آپ تفریح کے لیے جا کہاں رہی ہیں؟" رتھ فاؤ نے پوچھا۔

"میری خواہش ہے کہ ذرا ایچ ڈی ون گلیکسی کی سیر کرنے جاؤں۔"

"وہ جو زمینی اکائی کے مطابق ساڑھے تیرہ بلین نوری سال کے فاصلے پر ہے؟ خاصا وقت نہیں لگ جائے گا؟" میری کیوری نے کہا۔

"نہیں، مجھے بتایا گیا کہ یہاں کے وقت کے مطابق پانچ گھنٹے کی فلائیٹ ہے۔ چلنا ہے؟ مزا آ جائے گا!"

وہ بولی: "نہیں۔ بھئی مجھے تو ابھی بہت کام ہیں۔ میرا پراجیکٹ ہے غیر متمدن قدیم انسان کو ان کے ماضی سے نکالنا، کوئی آسان کام ہے یہ؟ دیکھو نا میں کئی ہفتوں سے ان لوگوں کے شعور کو بلند کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو ضد لگائے بیٹھے ہیں کہ ان کی کالونی میں وہی کچھ ہونا چاہیے جو ان کو آزمایش کے زمانے میں بتایا گیا تھا۔ وہی دودھ کی نہریں، شہد کی جھیلیں، چھلکتے جاموں اور رقاصاؤں کی محفل، بادشاہوں کے دربار کی سی آسایشیں اور فضائیں۔ اب ان کو لاکھ سمجھایا کہ یہ تو تمہارے زمانے میں جو کچھ بہترسے بہترین تھا، اس کی مثالوں سے ایک رف سا آئیڈیا دیا گیا تھا مگر وہ بضد ہیں کہ ایک دفعہ ہی سہی، وہی چاہیے۔" رُتھ فاؤ بولی۔

میں نے سوچا کہ وہ بے چاری یہاں بھی لوگوں کا علاج ہی کر رہی ہے، جسمانی نہ سہی نفسیاتی ہی!

"تم ان کا سوفٹ ویئر کیوں نہیں اپ ڈیٹ کرا دیتی؟" بلقیس ایدھی بولی۔

"نہ بھئی نا۔۔ یہاں کے قانون ہی بڑے نرالے ہیں، کسی پر دھونس زبردستی نہیں۔ کوئی خود سے بدلے تو بدلے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن میں نے اس کا حل نکال لیا ہے۔ بتاتی ہوں آپ کو"۔

اس سے پہلے وہ کچھ بتاتی۔ ایک عجیب سواری ہمارے سامنے آگئی۔ اب میں اس سواری کی آپ کو کیا مثال دوں؟ میں نے اس جیسا بھی پہلے کچھ نہیں دیکھ رکھا تھا۔ وہ قریب آکر رکی تو میں آپ سے آپ سمجھ گئی کی یہ کوئی اڑنے والی چیز ہے۔ میں ذرا کبیدہ خاطر ہوئی۔ ان شان دار خواتین کی رفاقت سے الگ ہونے لگی ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ خبر مجھے غیر محسوس طریقے سے دے دی گئی کہ آپ کے ذہن میں حضرت حاجرہ کے بارے میں سوالات کا جواب دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے قدم خود بخود اس اڑن کھٹولے کی طرف اٹھنے لگے۔ میں جیسی ہی بیٹھی، وہ خود بخود ہی اڑنے لگا۔ بڑے غضب کی سواری تھی۔ میں رنگوں کی دنیا میں، خوشبوؤں کی فضا میں، موسیقی کے سروں اور پرندوں کی اڑان کے ہمراہ محوِ پرواز تھی۔ میں نے موسیقی پر غور کیا تو صاف معلوم ہوا کہ یہ آواز تو کسی ہندستانی مغنیہ جیسی ہے ۔ میں آپ کو نام نہیں بتا سکتی۔ ہنسیں گے آپ مجھ پر۔ خیر میں موسیقی کے سروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ ایک عجیب جگہ رکی۔ اتری نہیں، بس آسمان ہی میں معلق ہو گئی۔ سامنے یوں لگا جیسے کسی نے کینوس لگا دیا ہے۔ پھر ایک بہت بڑی سکرین روشن ہو گئی۔ ارد گرد کا ماحول عجیب سے ملگجے اندھیرے میں بدل گیا اور میرے سامنے ایک چونکا دینے والا منظر تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہی تھی اس میں مجھے ایک قافلہ نظر آیا اور قافلہ بھی عجیب تھا۔ مجھے فوراً سمجھ میں آنے لگا۔ یہ تو حضرت ابراہیم کا قافلہ تھا۔ جانوروں کے ہمراہ، پورے ساز و سامان اور خدمت گاروں کے ساتھ۔ اور پھر کچھ نہ پوچھیے کہ میں نے کیا کچھ دیکھ ڈالا۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹے اس عجیب و غریب فلم کو دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا۔ میں سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ کسی کیمرے کی کارستانی نہیں تھی۔ یہ کوئی اداکاروں اور ڈائریکٹر کی مہارت نہیں تھی، یہ کسی ایڈیٹر کا چمتکار نہیں تھا۔۔۔ یہ تو ٹھیک وہی دور تھا! بالکل وہی دور۔ میں کسی تھری ڈی ایفیکٹ کی طرح اپنے آپ کو ان کے درمیان محسوس کر رہی تھی۔ مجھے سبھی سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ انسانوں کی کہانیاں دم چوڑ چکی تھیں۔ حقیقت آخری معنوں میں ظاہر ہو چکی تھی۔ ابراہیم تو پورے قافلے کے ساتھ مکہ کی وادی میں اپنی ملکاؤں کی طرح کی بیوی کے ساتھ اترے

تھے۔ وہاں انھوں نے کمپیہنگ کی۔ اور ایسا وہ وحی کے حکم کے مطابق کر رہے تھے۔ انھیں کچھ ہی دنوں بعد وہ چشمہ ملا جسے ہم زم زم کہتے ہیں۔ قریبی لوگ ان کو وہاں دیکھ کر آ گئے تھے۔ وہ ان کے آباؤاجداد کے جاننے والے تھے۔ پھر وہ وہاں کئی برس رہے۔ اسماعیل بھاگنے دوڑنے والے ہوئے تو وہ حاجرہ کو بتا کر، بہت اچھا بندوبست کر کے روانہ ہوئے۔ کنعان میں خاندان کے دوسرے حصے سارہ کی فیملی کے پاس گئے۔ میرے ہر سوال کا جواب مل چکا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اور بھی لوگ میری طرح اڑن کھٹولوں میں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

یہ منفرد شو ختم ہوا تو مجھے ایک محفل میں لے جایا گیا۔ مجھے لگا کہ اب یہاں کھانے پینے کا کچھ بندو بست ہو گا۔ یہ بڑے سے شیشے کے پیالے کی طرح کی کوئی جگہ تھی۔ اس کے اندر جھولوں کی نشستیں لگی تھیں۔ لوگ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان کے آگے کھانے کی پلیٹیں حرکت کرتی آتیں۔ جس کے جی میں کھانے کی تمنا ہوتی وہ اس کے آگے آ کر رک جاتی۔

اس سے پہلے کہ میں ماحول سے اپنے آپ کو مانوس کرتی ایک آواز سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا: "ہاں میرے پروردگار نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہے نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ یہاں سب کچھ وہی ہوتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔"

پھر میں ایک منظر کو دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ میں جس چہرے پر نظریں مرکوز کیے بیٹھی تھی اس کو کیسے بھلا سکتی تھی۔ یہ تو درس والی وہی ڈنمارک سے آئی لڑکی تھی جس نے مجھ سے جنت کے بارے میں انتہائی گستاخانہ باتیں پوچھی تھیں۔ پریشان ہو گئی کہ یہ کم بخت یہاں کیا کر رہی ہے؟ اتنے میں اس کی نشست گھومتی ہوئی میرے قریب آنے لگی۔ مجھے تو پہلے ہی اس پر بہت غصہ تھا۔ وہ اب میرے بالکل قریب آ چکی تھی۔ میں اس کی طرف جھکی پھر لپکی۔ اب میں نے پورے زور سے ہاتھ گھمایا۔ جیسے ہی میں نے ہاتھ گھمایا، ایک تیز آواز سنی:

"یہ کیا کر رہی ہو؟ میں ہاتھ بڑھا کر پکڑ نہ لیتا تو تپائی پر رکھا یہ قرآن مجید نیچے گر پڑتا۔ یہ دیکھو میں نے کس مشکل سے پکڑا ہے۔"

راشد نے گرتا قرآن ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور اسے احترام سے چوم رہا تھا۔ وہ شاید پانی پینے اٹھا تھا۔
میری آنکھ کھل چکی تھی۔۔ مکمل کھل چکی تھی!

فلم پر تبصرہ

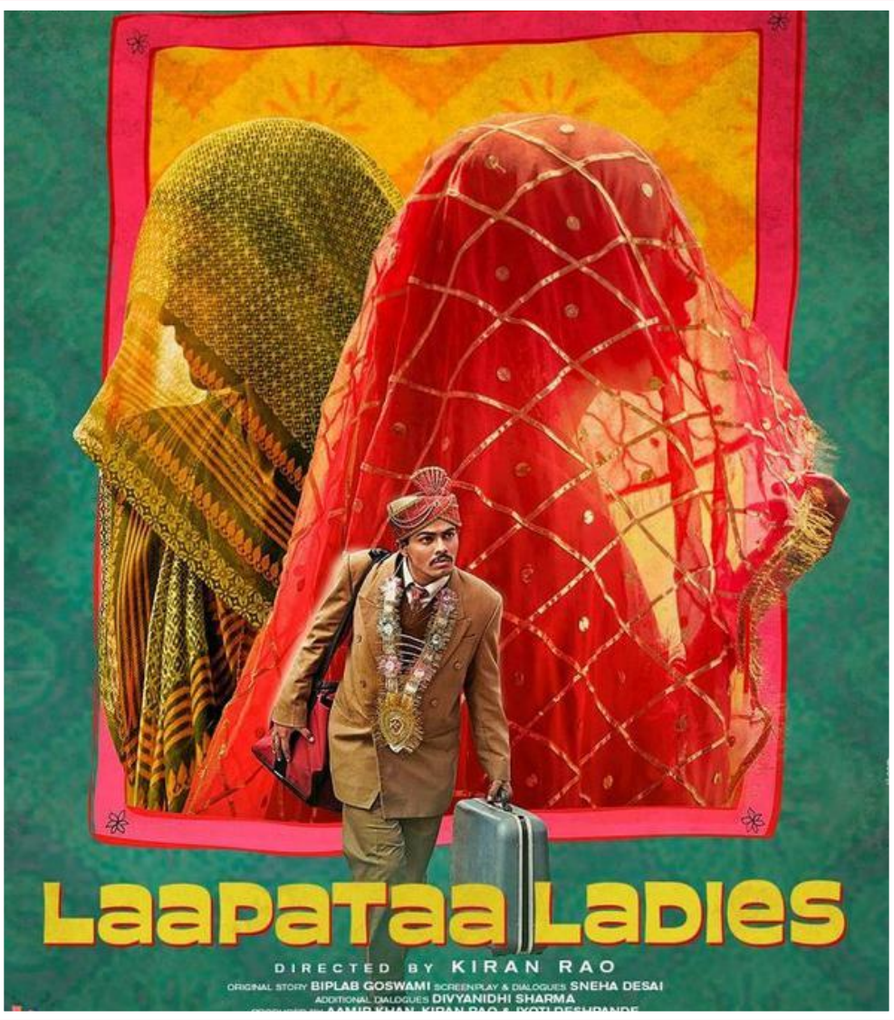

لاپتا لیڈیز

ہدایت کار: کرن راؤ

مصنف: بپلب گوسوامی

سکرین پلے: سنہا ڈیسائی

دورانیہ: دو گھنٹے دو منٹ

برصغیر میں عورتوں کو کئی ایسے مسائل درپیش ہیں جو ان کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی ترقی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ روایت کی خاطر اولاد کی قربانی، جہیز کی لعنت، تعلیمِ نسواں میں رکاوٹ، بے جا اور اوہام پر مبنی رسوم ورواج کی پاس داری، مرد کی ظالمانہ مردانگی اور معاشرے کی عمومی جہالت۔ ان سب مسائل کا اثر بہت گہرا ہے۔ مرد عورت کے عقل وشعور پر پابندیاں لگا کر سمجھتا ہے کہ اس نے عورت کو قابو کر لیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس سے خود اس کی زندگی کس قدر متاثر ہوتی ہے۔ زیر تبصرہ فلم ان ساری حقیقتوں کو بہت دل چسپ انداز سے سامنے لاتی ہے۔

فلم ''لاپتہ لیڈیز'' انسان کے ادبی سفر کا بہت خوب صورت پڑاؤ ہے۔ اس فلم میں اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ جہالت کے اندھیروں میں جب کوئی اپنا لاپتا ہوتا ہے تو علم کی لو وہ روشنی مہیا کرتی ہے جس سے آگے آنے والی نسلوں تک کو ترقی کی راہ دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔

اس فلم کی ڈائریکٹر کرن راؤ نے مصنف گوسوامی سے مل کر ایسی کہانی بنائی ہے جو آپ کی دل چسپی کو آخری لمحے تک شدت کے ساتھ برقرار رکھتی ہے۔ پوری فلم کے مکالموں کو سنہا ڈسائی نے بے انتہا سادہ اور کرداروں کی سمجھ بوجھ کے مطابق رکھا ہے لیکن وہ پھر بھی بہت جاندار ہیں۔ فلم بالی وڈ کے روایتی گلیمر سے بالکل بے نیاز ہے۔ ڈائریکٹر کرن راؤ نے انتہائی کم بجٹ میں بہت سے نئے اداکاروں سے ایسی کام یاب فلم بنا ڈالی ہے جسے ہندستان نے آسکر مقابلے کے لیے بھی نامزد کر دیا ہے۔

فلم کی کہانی کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ ٹرین کے سفر میں ایک ہی ڈبے میں کئی نئی نویلی دلہنیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ سب نے اپنے چہرے رواج کے مطابق مکمل طور پر چھپائے ہوتے ہیں۔ تقریباً ایک سے لباس پہنے ہیں۔ اس وجہ سے غلطی سے ایک دلہن کو کوئی دوسرا دولہا لے کر ٹرین سے اتر جاتا ہے اور اصل دلہن دربدر ہو جاتی ہے۔ بچھڑنے والی دلہن ان پڑھ ہے اور دوسری علم کی پیاسی اور ظلم کی ماری۔ ایک کا شوہر لالچی شکاری تو دوسری کا وفا اور محبت کا پتلا۔

فلم میں بدل جانے والی دلہنیں "جیا" اور ''پھول''، تھانے دار انسپکٹر شیام منوہر اور ریلوے اسٹیشن پر مردوں کی ستائی ہوئی مگر ان سے کامیاب مقابلہ کرنے والی دادی منجو مائی، اس فلم کے زوردار کردار ہیں۔ ان پڑھ دلہن پھول اور اس سے بچھڑ جانے والا عام سے شعور والا شوہر دیپک، جس محبت اور اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بہت دل موہ لینے والا ہے۔

جیا کو آرگینک فارمنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا عزم اس کو کسی چیز سے نہیں روک پاتا۔ وہاں پھول ایک انجان اسٹیشن پر دیپک کا انتظار کرتی ہے اور ساتھ ہی منجو مائی کے ٹھیلے پر قلاقند بیچ کر خود مختار ہونے کی اہمیت سیکھتی ہے۔

فلم میں ہندوستان کے ایک امیجنری گاؤں سورج مکھی کی زندگی کو بڑی سادگی اور خوب صورتی سے دکھایا گیا ہے۔ فلم کا ساؤنڈ ٹریک دیکھنے والے کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ عورت کی فطرت میں پنہاں سبھی نازک جذبات اور انسان کی نیک اور صالح فطرت میں برائی کے باوجود بھلائی کی انگڑائی، لڑکیوں کے تعلیم یافتہ ہونے اور خود مختار ہونے کی امنگ، یہ سب عناصر فلم ''لاپتا لیڈیز'' کو ایک انتہائی فکر انگیز اور دلکش فلم کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

(تبصرہ: وجیہہ حسان واحدی)

تبصرہ نگار: صباحت واحدی

دا مومنٹ آف لفٹ

The Moment of Lift: How Empowering Women Changes the World

زبان: انگریزی

مصنفہ: ملنڈا فرینچ گیٹس

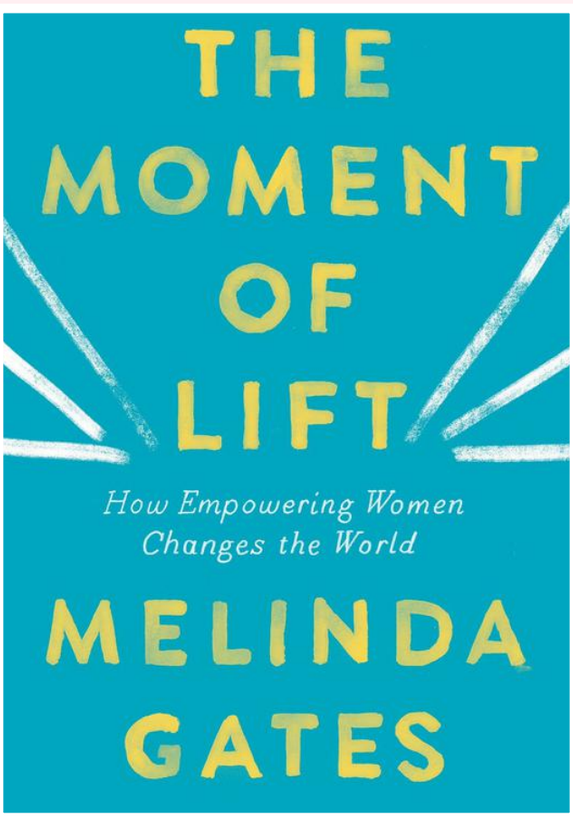

ملنڈا گیٹس کی یہ کتاب عورتوں کو بااختیار کرنے کی ضرورت پر ایک متاثر کن اور قابل عمل پالیسی تجویز کرتی ہے جو سرحدوں اور ثقافتوں سے بے نیاز ہے۔ یعنی ہر معاشرے کی خواتین اس پر عمل کر سکتی ہیں۔ بِل اور ملنڈا گیٹس فاؤنڈیشن کے تجربات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، گیٹس نے عورتوں کو بااختیار کرنے کی ضرورت کو گلوبل تبدیلی کا ایک اہم ترین عنصر کہا ہے۔

گیٹس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ حقیقی ترقی خواتین کے حالات سے منسلک ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ عورتوں کی تعلیم، صحت اور اقتصادی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کرنا نہ صرف ایک اخلاقی ذمہ داری ہے بلکہ ہر کمیونٹی اور قوم کی خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ عورتوں کی بااختیاری کو وسیع تر سماجی فوائد سے جوڑتی ہیں: اور یہ ثابت کرتی ہیں کے جب عورت ترقی کرتی ہے تو سماج ترقی کرتا ہے۔

مصنفہ نے اپنے فلاحِ انسانیت اور خیراتی کام کے لیے دنیا بھر میں بے شمار سفر کیے۔ اس دوران میں وہ جن واقعات سے متاثر ہوئی ہیں، بیان کرتی ہیں تاکہ پڑھنے والے کو عالمی مسائل کے تلخ حقائق سے آگاہ کر سکیں۔ جیسے نئی ماں اور نوزائدہ کی صحت، خاندانی منصوبہ بندی، لڑکیوں کی تعلیم اور کم عمری میں شادیاں۔ کام کی جگہ پر خواتین کے بارے میں باندھا گیا باب ان لوگوں کے لیے خاص طور پر اہم ہے جو تنوع اور شمولیت کی حمایت کرتے ہیں۔

اپنی اس داستان میں گیٹس نے برانے براؤن اور ملالہ یوسفزئی کے کام کو تسلیم کیا ہے، جو فکر انگیز کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ گیٹس اپنی کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی ان تنظیموں کو عطیہ کر رہی ہیں جو دنیا بھر میں خواتین کے حالات کو اوپر اٹھانے کے لیے اپنے کام کو آگے بڑھاتی ہیں۔

صنفی مساوات میں سرمایہ کاری کرنے والے ہر فرد کو مومنٹ آف لفٹ ضرور پڑھنی چاہیے—جو ہم سب کو ہونا چاہیے! ذاتی کہانیوں کو عالمی چیلنجوں سے جوڑ کر، گیٹس ہمیں قائل کرتی ہیں کہ خواتین کو بااختیار اور بلند کرنا بالآخر ہم سب کو بااختیا اور بلند کرنا ہے۔ یہ ایک دل کو چھو لینے والی یاد دہانی ہے کہ حقوقِ نسواں صرف خواتین کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ یہ انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ہے۔